اشاعت کا ۹۷ واں سال

زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

اگست ۲۰۱۹ء

۱۵؍روپئے

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اترپردیش

اتر پردیش کی گورنر محترمہ آنندی بین پٹیل وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ کو
راج بھون، لکھنؤ میں رکشا بندھن کے موقع پر راکھی باندھتی ہوئیں (۱۵/اگست ۲۰۱۹ء)

اتر پردیش کی گورنر محترمہ آنندی بین پٹیل، وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ اور نائب وزیر اعلیٰ ڈاکٹر دنیش شرما
ریزرو پولیس لائنس میں 'شری کرشن جنموتسو' کے موقع پر شمع روشن کر کے پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے (۲۳/اگست ۲۰۱۹ء)

اتر پردیش کی گورنر محترمہ آنندی بین پٹیل اور وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ
راج بھون میں منعقد حلف برداری تقریب کے موقع پر (۲۱/اگست ۲۰۱۹ء)

جلد : ۷۴ شمارہ:۸

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

اگست ۲۰۱۹ء

پبلشر: ششر

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

ایڈیٹوریل بورڈ

شرینواس ترپاٹھی، غزال ضیغم

ایڈیٹر

سید عاصم رضا

فون: 9936673292

Email: nayadaurmonthly@gmail.com

معاون

شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِ سالانہ

صباعرفی

فون: 7705800953

تزئین کار : وقار حسین

تصاویر: فوٹو سیکشن، محکمہ اطلاعات ورابطۂ عامہ

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

زرِ سالانہ : ۱۸۰ روپئے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Please send Cheque/Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیادور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعۂ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیادور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

۶ پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

اس شمارے میں...

اداریہ

اپنی بات ۲

گوشۂ یوم آزادی

حریت (نظم) ...... رباب رشیدی ۳

میں اس کو ڈھونڈ رہا ہوں (نظم) ...... اجمل سلطانپوری ۴

جشن آزادی آج کے تناظر میں ...... ڈاکٹر ریشماں پروین ۵

مضامین

شارب ردولوی کی خاکہ نگاری ...... ڈاکٹر عرشیہ جبین ۸

کرشن چندر کی ناول نگاری اور ترقی پسند تحریک ...... محمد پرویز خان ۱۴

نیر سلطانپوری؛ تہذیبی قدروں کا امین ...... خان محمد رضوان ۱۸

کائستھ فرقے کی ادبی خدمات ...... پی پی شریواستو رندؔ ۲۲

اصناف کا تصور اور اردو کی اصناف سخن ...... خان احمد فاروق ۲۵

خودنوشت سوانح نگاری کا نسائی زاویہ ...... سید وجاہت مظہر ۳۰

پروفیسر یوسف سرمست کی ادبی خدمات ...... نظیر احمد گنائی ۳۸

اب تو بس آواز ہی آواز ہے: شفاعت علی صدیقی ...... رفعت عزمی ۴۳

اقبال کا نظریۂ تصوف ...... صفت زہرا ۴۵

افسانے

خلیج ...... اسرار گاندھی ۴۹

کہانی کی تلاش ...... عبید اللہ چودھری ۵۵

غزلیں

غزلیں ...... مختار ٹونکی، ارشاد احمد کامل ۵۸

غزلیں ...... ڈاکٹر احمد امتیاز، ڈاکٹر حمایت جائسی ۵۹

غزلیں ...... اسماعیل پرواز، احسان سیوانی ۶۰

تبصرہ

عابد سہیل کے افسانوں میں عصری حسیت (مصنفہ: مسرت جہاں) ...... مبصر: پروفیسر علی احمد فاطمی ۶۱

پروفیسر مہدی حسین ناصری ...... (مصنف: وقار ناصری) ...... مبصر: ڈاکٹر زیبا محمود ۶۲

افسانوی ادب اور حیات اللہ انصاری ... (مصنف: محمد اویس سنبھلی) ... مبصر: ڈاکٹر سلمان فیصل ۶۳

اختصاص تنقید ...... (مصنفہ: عطیہ رئیس) ...... مبصر: ڈاکٹر امتیاز احمد ۶۴

نیادور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

اپنی بات

اگست ۲۰۱۹ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔یہ شمارہ عام شمارہ ہوتے ہوئے بھی ادبی لحاظ سے بہت اہم ہے۔اس میں آزادی پر ایک گوشہ شامل ہے۔ پندرہ اگست ہماری ملک کی تاریخ پر سب سے اہم دن ہے۔ پندرہ اگست کو ہمیں اس جنگ میں کامیابی ملی جو ہمارے بزرگوں نے 1857 میں شروع کی تھی اور جس کے لئے بے شمار لوگوں نے جانیں دی تھیں اور اذیت ناک سزائیں کاٹی تھیں۔ پندرہ اگست کو ہم نے آزاد فضاؤں میں۔پہلی بار سانس لی۔آج ہماری آزادی کو 72 سال ہو چکے ہیں ہمیں فخر ہیں کہ ہمارے ملک نے ان 72 برسوں میں ہر شعبہ میں اتنی ترقی کی ہے کہ ہم دنیا کی بڑی طاقتوں کے برابر کھڑے ہیں۔

اس شمارے میں 9 تنقیدی مضامین و تجزیات ہیں۔ڈاکٹر عرشیہ جبیں نے شارب ردولوی کی خاکہ نگاری پر مضمون لکھا ہے۔شارب ردولوی اردو کے مشہور ناقدوں میں ہیں لیکن ڈاکٹر عرشیہ جبیں نے ان کی تنقید سے الگ ان کے خاکے تلاش کر کے ان کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے جو یقیناً قارئین کے لئے دلچسپ ہوگا۔

محمد پرویز خاں نے کرشن چندر کی ناول نگاری اور ترقی پسند تحریک سے اپنے مضمون میں بحث کی ہے کرشن چند اپنے عہد کے بہت اہم فکشن رائٹر اور مقبول افسانہ نگار تھے اپنے نظریات کے تحت وہ ترقی پسند تھے ان کے افسانے اور ناول انسانی زندگی اس کے کرب اس کی کامیابی و ناکامی سے متعلق ہیں اس مضمون میں مصنف نے ترقی پسند تحریک کے رجحانات کی روشنی میں کرشن چند کے ناولوں کا مطالعہ کیا ہے۔

نیر سلطانپوری ہمارے عہد کے بہت اہم شاعروں میں ہیں جنھوں نے ایک ادبی صحافی کی حیثیت سے اردو بان اور اس کی تہذیبی قدروں کو فروغ دیا۔خان محمد رضوان صاحب نے 'نیر سلطانپوری؛ تہذیبی قدروں کا امین' میں ان کی شاعری اور ان کی خدمات کا تجزیہ کیا ہے۔

پی پی شریواستوا رند ہمارے بزرگ اور مشہور شاعروں میں ہیں وہ ایک اچھے مصنف بھی ہیں اس بار انھوں نے کائستھ فرقہ کے خاندان اور 150 برس کے موضوع پر ایک دلچسپ اور معلومات افزا مضمون تحریر کیا ہے۔کائستھ فرقہ ہمارے ملک میں ایک علمی و ادبی طبقہ کی شکل میں مشہور ہے۔ پی پی شریواستوا رند نے اس کے ایک اہم خاندان کے 150 سال پورے ہونے پر اس کی کارکردگی اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔جو پورے فرقہ کے جذبات کا احاطہ کر لیتا ہے۔

ڈاکٹر خان احمد فاروق اردو کے اہم اسکالر ہیں۔انھوں نے اصناف کے تصور اور اردو اصناف سخن پر مضمون لکھا۔یہ ایک اہم مطالعہ ہے اصناف کیوں اور کس طرح وجود میں آتی ہیں اور پھر وقت کی ساتھ

نیا دور فیس بک اور واٹس اپ پر بھی
نیا دور کے شمارے مئی ۲۰۱۷ء تا حال
واٹس اپ اور ویب سائٹ پر
قارئین کے مطالعہ لئے پوسٹ کئے جا رہے ہیں

دھیرے دھیرے تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں خاص طور پر اردو اصناف کی کیا اہمیت اور نوعیت ہے۔

سید وجاہت مظہر نے خودنوشت سوانح نگاری کا نسائی زاویہ کے عنوان سے مضمون لکھا ہے۔ آج نسائیت Feminism اور نسائی مطالعہ کا بہت زور ہے اور ادب و تنقید میں نسائی مطالعہ کا ایک الگ شعبہ بن گیا ہے۔سید وجاہت مظہر نے خودنوشت میں اسی گوشے کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

نظیر احمد گنائی نے پروفیسر یوسف سرمست کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے ڈاکٹر یوسف سرمست ہمارے اہم ناقدوں میں ہیں اور اردو فکشن تنقید میں ان کی بڑی اہمیت ہے۔ابھی حال میں انکا انتقال ہو گیا لیکن اپنی تحریروں میں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

رفعت عزمی نے 'اب تو بس آواز ہی آواز ہے' کے عنوان سے شفاعت علی سندیلوی مرحوم کی خدمات کا جائزہ لیا ہے شفاعت علی سندیلوی آل انڈیا ریڈیو سے متعلق تھے جہاں انھوں نے اردو کو مختلف طریقوں سے فروغ دینے کی کوشش کی۔انھوں نے دلچسپ اور کارآمد مضامین اور ڈرامے خود لکھے اور دوسروں سے لکھوا کر نشر کئے۔ان کا شمار ہندوستان کے مشہور براڈ کاسٹر میں ہوتا ہے۔رفعت عزمی نے انکی شخصیت اور ان کی خدمات کا ایک دلکش جائزہ اس مضمون میں پیش کیا۔

صفت زہرا نے اقبال کے نظریہ تصوف کا اپنے مضمون میں جائزہ لیا ہے تصوف ہماری شاعری کا ایک مقبول موضوع رہا ہے اور ابتدا سے آج تک شعرا نے تصوف کے مختلف نکات کو شاعری کا موضوع بنایا ہے اور بہت اچھے مضامین تحریر کئے ہیں۔قدیم شعرا نے اس موضوع پر بہت طبع آزمائی کی ہے لیکن اقبال نے ان سے الگ تصوف کا ایک نقطہ نظر پیش کیا ہے۔صفت زہرا نے اسے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس شمارے میں اسرار گاندھی اور عبیداللہ چوہدری کے افسانے شامل اشاعت ہیں۔ یہ دونوں حضرات ہمارے معتبر افسانہ نگار ہیں۔افسانے کا حصہ بظاہر مختصر صحیح لیکن آپ کو پسند آئے گا۔

منظومات کے حصہ میں مختار ٹونکی ،ارشاد احمد کامل، احمد امتیاز ،حمایت جائسی، اسماعیل پرواز اور احساس سیوانی کا کلام شامل اشاعت ہے۔شمارے میں آپ کی آرا کے علاوہ چار اردو کی اہم کتابوں پر تبصرے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ مجموعی حیثیت سے یہ شمارہ آپ کو پسند آئے گا۔مجھے آپکی رائے کا انتظار رہے گا۔

ایک بات

اردو محبت یکجہتی اور رواداری کی زبان ہے اس کی حفاظت اور فروغ آپ کی ذمہ داری ہے۔اردو پڑھئے اور اپنے بچوں کو اردو پڑھائے۔

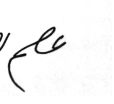

رباب رشیدی
تازی خانہ، امین آباد، لکھنؤ
موبائل: 9335018112

حُرّیت

پھر جشن نو بہار کا ساماں ہوا تو ہے
پھر شہر آرزو میں چراغاں ہوا تو ہے

پھر پندرہ اگست کا سورج ہوا طلوع
پھر زندگی کا خیر سے امکاں ہوا تو ہے

پھر سبز سبز شاخوں پہ کھلنے لگے گلاب
پھر اک خیال خلد بداماں ہوا تو ہے

پھر تلخیٔ حیا ت کا احساس مٹ گیا
پیدا مذاق سیر گلستاں ہوا تو ہے

پھر کارگاہِ زیست میں کچھ باب کھل گئے
پھر آئینوں میں حسن نمایاں ہوا تو ہے

رعنائیاں سمٹ گئیں لفظ و بیان میں
پھر ذوق شعر دل میں فروزاں ہوا تو ہے

پھر پیچ دار راستے ہموار ہو گئے
پھر مطمئن مزاج پریشاں ہوا تو ہے

پھر منتشر خیالی کہیں جاکے کھو گئی
پھر مسکرا کے جینے کا ارماں ہوا تو ہے

پھر حرف شوق آکے زباں پر مچل گیا
فیضان انبساط فراواں ہوا تو ہے

احساس خوشگوار لئے آگئی نسیم
پھر درد و اضطراب کا درماں ہوا تو ہے

کیا کیا لہو بہایا گیا جس کے واسطے
تاریخ حریت کا وہ عنواں ہوا تو ہے

اوراق رفتہ کھلنے لگے اپنے آپ ہی
تیرا گزر بھی گردش دوراں ہوا تو ہے

جو شیخ و برہمن تھے سبھی ایک ہو گئے
یہ انقلاب ایسے میں ہاں ہاں ہوا تو ہے

یہ اتحاد وقت کا پیغام ضوفشاں
پہلے بھی یہ سکون دل و جاں ہوا تو ہے

اجمل سلطانپوری
خیرآباد، سلطانپور
موبائل: 9451295962

میں اس کو ڈھونڈھ رہا ہوں

مسلمان اور ہندو کی جان
کہاں ہے میرا ہندوستان
میں اس کو ڈھونڈھ رہا ہوں

مرے بچپن کا ہندوستان
نہ بنگلہ دیش نہ پاکستان
میری آشا میرا ارمان
وہ پورا پورا ہندوستان
میں اس کو ڈھونڈھ رہا ہوں

وہ میرا بچپن، وہ اسکول
وہ کچی سڑکیں، اڑتی دھول
لہکتے باغ، مہکتے پھول
وہ میرے کھیت مرا کھلیہان
میں اس کو ڈھونڈھ رہا ہوں

وہ اردو غزلیں ہندی گیت
کہیں وہ پیار، کہیں وہ پریت
پہاڑی جھرنوں کے سنگیت
دیہاتی لہنا، پُربی تان
میں اس کو ڈھونڈھ رہا ہوں

جہاں کے کرشن، جہاں کے رام
جہاں کی شام، سلونی شام
جہاں کی صبح، بنارس دھام
جہاں بھگوان کریں اشنان
میں اس کو ڈھونڈھ رہا ہوں

جہاں تھے تلسیؔ اور کبیرؔ
جائسیؔ جیسے پیر فقیر
جہاں تھے مومنؔ، غالبؔ، میرؔ
جہاں تھے رحیمنؔ اور رس کھانؔ
میں اس کو ڈھونڈھ رہا ہوں

وہ میرے پرکھوں کی جاگیر
کراچی، لاہور و کشمیر
وہ بالکل شیر کی سی تصویر
وہ پورا پورا ہندوستان
میں اس کو ڈھونڈھ رہا ہوں

جہاں کی پاک پوتر زمین
جہاں کی مٹی خلد نشین
جہاں مہراج معین الدین
غریب نواز ہندوستان
میں اس کو ڈھونڈھ رہا ہوں

یہ بھوکا شاعر پیاسا کوی
سسکتا چاند، سلگتا روی
وہ جس مُدرا میں ایسی چھوی
کرا دے اجملؔ کو جل پان
میں اس کو ڈھونڈھ رہا ہوں

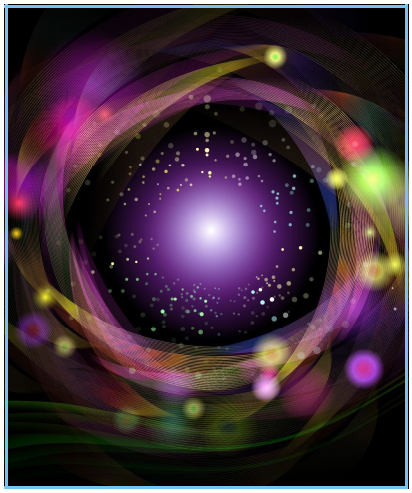

جشن آزادی آج کے تناظر میں

ڈاکٹر ریشماں پروین

صدر شعبۂ اردو

کھن کھن جی گرلس پی جی کالج

لکھنؤ

رابطہ: 7565086830

۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء ہماری تاریخ کا سنہرا دن ہے۔اس مبارک دن ہمیں برسوں کی غلامی سے نجات ملی۔سونے کی چڑیا کہلانے والے ہمارے خوبصورت ملک پر انگریزوں نے بڑی عیاری سے تجارت کے بہانے قبضہ کیا تھا اور آہستہ آہستہ ہندوستان کے حکمراں بن بیٹھے تھے۔اپنے دورِ حکومت میں انگریزوں نے ظلم وستم اور جبر واستبداد کی ساری حدیں پار کردی تھیں جس کے نتیجہ میں ایک وقت ایسا آیا کہ ہندوستان کا بچہ بچہ 'انقلاب زندہ باد' کے نعرے لگاتا ہوا انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔شمع آزادی کے ان پروانوں، شاعروں، ادیبوں، دانشوروں، فنکاروں اور صحافیوں کی بے مثال قربانیوں کے سبب انگریز حکومت ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہوئی، بقول مسلم آفاقی:

انگریز آئے ملک میں تاجر کے روپ میں
پھر رفتہ رفتہ بنتے گئے حکمرانِ ہند
لیکن یہ سرزمیں ، نہ وطن ان کا بن سکی
چبھتی رہی ہمیشہ دلوں میں سنان ہند

۱۵؍اگست دراصل ہمارے آزادی کے متوالوں کو یاد کرنے اور انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کا دن ہے۔جنھوں نے وطن سے محبت کا درس دیا،اور سامراج دشمنی کے ساتھ انگریزوں کے خلاف ایسی فضا تیار کردی جس نے انگریزوں کو آخر کار یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ 'اب یہاں تیرا گزر ممکن نہیں'،ان حضرات کی مدد ہمارے شعراء وادباء نے کی۔

اپنے کلام اور تقریروں کے ذریعہ انھوں نے سارے ہندوستان میں حریت وآزادی کے جذبات کو بیدار کرنے میں اہم رول ادا کیا۔آزادی کے ان متوالوں نے زندہ رہتے ہوئے ہی کہہ دیا تھا:

وطن کی خاک سے مرکر بھی ہم کو انس باقی ہے
مزا دامانِ مادر کا ہے اس مٹی کے دامن میں

(چکبست)

وطن سے محبت کی دیوانگی میں انھوں نے تمام رشتوں کو قربان کردیا یہاں تک کہ محبوب سے بھی صاف صاف کہہ دیا

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ
اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
(فیض)

ملک کی آزادی کے خواب نے ان نوجوانوں کو یکجا کردیا اسی اتحاد و اتفاق کا نتیجہ پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کی شکل میں سامنے آیا۔ جوش ملیح آبادی کی نظم 'شکست زنداں کا خواب' ملاحظہ کیجیے کہ جب ظلم و بربریت کی انتہا ہوتی ہے انقلاب ضرور آتا ہے اور ظالم طبقے کی شکست یقینی ہوجاتی ہے۔

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی، اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے، بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا ان کو خبر تھی؟ زیر و زبر رکھتے تھے جو روحِ ملت کو
ابلیں گے زمیں سے مارسیہ، برسیں گی فلک سے شمشیریں
کیا انکو خبر تھی؟ سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز، اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
کیا ان کو خبر تھی؟ ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں
سنبھلو! کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو! کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو! کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

ظالم طبقے کی شکست ہوئی، آزادی ملی، آزادی کے متوالے ہندوستان کے مشہور و معروف کوی پردیپ بے اختیار کہہ اٹھے۔

ہم لائے ہیں طوفان سے کشتی نکال کے

مجاہدین آزادی طوفان سے کشتی نکال لائے اور اس کشتی کی پتوار اپنے بعد کی نسل کو سونپ دی، مگر جن کے ہاتھوں ملک کی باگ ڈور سونپی گئی کیا انھوں نے ملک کو اس طرح سنبھالا؟ جیسا خواب آزادی کے لیے اپنی جان قربان کرنے والوں نے دیکھا تھا۔ ایسے اور نہ جانے کتنے سوالات ذہن و دماغ میں سر اٹھاتے ہیں مگر ایک بات بالکل حقیقت ہے کہ طوفان سے کشتی کے نکلنے کے بعد ہم سب اسے سنبھالنے کے ذمہ دار ہیں اور یہ ذمہ داری کسی مخصوص فرقہ کی نہیں ہر ہندوستانی کی ہے خصوصاً ان حضرات کی جن کی ماضی اور حالات حاضرہ پر گہری نظر ہے، سوال یہ ہے؟ کہ آخر ملک کی حفظ و بقاء اور ترقی کے لیے آزادی سے لے کر اب تک ہم سب نے کیا کیا؟ جواب شاید نفی میں آئے۔ ہم صرف اپنی ذمہ داریوں سے مفر چاہتے ہیں۔ اگر ہمارا یہ حال ہے تو سوچیں کہ آگے آنے والی نئی نسل کا کیا ہوگا، لہٰذا ضرورت وقت ہمیں اپنے محاسبہ کی تلقین کررہی ہے اور اس کے لیے ہمیں اپنے زبان و ادب سے ہر ممکن مدد لی سکتی ہے جیسا کہ روہت نندن صاحب نے لکھا ہے:

''ادب اس تہذیبی وراثت کا نام جس میں قوموں اور ملکوں کے عروج و زوال کی داستانیں چھپی ہوتی ہیں اور جس کے ذریعہ سے کسی بھی ملک کے تمدنی مزاج، خصوصیات، رفتار، ترقی اور ان تمام انقلابات، تغیرات کو سمجھا جاسکتا ہے جس سے وہ ملک دوچار رہا ہے، ادب اپنے وسیع تر مفہوم میں ماضی کے تجربات کی بنا پر مستقبل کی شاہراہ تعمیر کرتا ہے اور اس طرح ادب کی دنیا ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔(۱)

روہت نندن صاحب نے ادب کی اہم خوبی یہ قرار دی ہے کہ وہ ماضی کے تجربات کی بنا پر مستقبل کی شاہراہ تعمیر کرتا ہے، ان کی بات سو فیصد صحیح ہے جب تک ہم اپنے ماضی سے واقف نہیں ہوں گے ایک بہتر مستقبل کی تعمیر کیسے کریں گے۔ لہٰذا جشن آزادی کو حقیقی معنوں میں جشن آزادی کی صورت میں منانے کے لیے ہمیں ماضی کے اوراق سے ان قربانیوں کی تفصیل کو ڈھونڈھنا ہوگا، جنھیں آج ہم صرف نام لے کر بس کردیتے ہیں ہماری زبان یقیناً اس سلسلے میں میل کا پتھر ثابت ہوگی کیونکہ یہ وہ زبان ہے جسے مختلف مذاہب کے ماننے والوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے پھر وہ رام پرشاد بسمل ہوں، چکبست ہوں، جوش ملیح آبادی یا فیض احمد فیض اور فراق جیسا کہ روہت صاحب نے مزید لکھا ہے۔

''اردو ادب بھی ہماری ایسی ہی تہذیبی میراث ہے جس پر بجا طور پر فخر کیا جاسکتا ہے اس کے لالہ زاروں کی آبیاری میں ہندوستان کے مختلف مذہب رکھنے والے دانشوروں کا خون جگر شامل ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو ادب نے ہماری قومی تاریخ کے ہر نازک موڑ پر اپنا فریضہ انجام دیا ہے اور آزادی کی جدوجہد سے لے کر دورِ حاضر تک ہر نازک مرحلے کو اردو ادب سے روشنی ملی ہے آج بھی جب ہم فراق صاحب کا شعر پڑھتے ہیں:

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرت پرواز کی باتیں کرو

تو وہ ''نور'' جو آزادی کے سنگھرش کے زمانے میں روشنی دکھا رہا تھا وہی 'نور' آج بھی حوصلہ بخش رہا ہے، یا جب ہم پڑھتے ہیں

دیکھو رفتار انقلاب فراق
کتنی آہستہ اور کتنی تیز

تو ہماری نظروں کے سامنے وہ سارے انقلابات آجاتے ہیں جو بڑی خاموشی سے ہماری زندگی میں رونما ہوئے اور جنھوں نے ہندوستان کی

سماجی زندگی کا ڈھانچہ بدل دیا اور نئی تہذیبی قدروں سے ہمیں آشنا کیا۔(۲)

چنانچہ آج ضرورت ہے کہ ہم اپنی تاریخ کے نہاں خانوں سے اپنے بزرگوں کی قربانیوں کی داستانوں سے نئی نسل کو واقف کرائیں جس سے نوجوان نسل کی ذہن سازی اور ان کے اندر جذبہ غیرت وحمیت کو بیدار کیا جاسکے اور یہ کسی ایک شخص کا کام نہیں اس کے لیے ہم سب کو مسلسل جدوجہد کرنی ہوگی جس طرح ہم نے آزادی کی تحریک میں بغیر تفریق مذہب وملت اتحاد کا مظاہرہ کیا تھا آج بھی ہمیں اپنے ملک کی بقا اور ترقی و کامرانی کے لیے مسلسل جدوجہد کرنی ہوگی۔صرف اردو ہی نہیں ملک کی ہر زبان سے آزادی کے لیے جان کی بازی لگانے والے بزرگوں کی قربانیوں کو از سر نو نئی نسل کے سامنے لانا ہوگا، تمام زبانوں کے ادب سے آزادی کے لیے لکھی گئی تخلیقات کو نکال کر انھیں نصاب میں شامل کرنا ہوگا تاکہ آنے والی نسلیں جان سکیں کہ پندرہ اگست ۱۹۴۷ کی یاد میں منایا گیا جشن یک روزہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک دائمی تحریک ہے جو سدا ہمیں روشنی دیتی رہیگی ہم اس کے ذریعہ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے کوشاں ہوسکتے ہیں جن کے لیے ہم نے آزادی حاصل کی تھی اور اس کی بنیاد محبت واخوت تھی

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

ہماری آپسی یگانگت ومحبت، ہماری گنگا جمنی تہذیب جسے ساری دنیا حسرت سے دیکھتی ہے آج بھی ایک مثال ہے تو کیوں نہ ہم مادر وطن کے لیے روشنی کی کرن بن جائیں ہمارے وزیر اعظم نریندر مودی جی نے آکاشوانی سے اپنے ماہانہ پروگرام ''من کی بات'' میں ملک کے عوام سے یوم آزادی نئے طریقے سے منانے اور اسے لوگوں کو تہوار بنانے کی اپیل کی ہے، انھوں نے کہا:

''اگست کا مہینہ 'بھارت چھوڑو' کی یاد لے کر آتا ہے۔میں چاہوں گا کہ آپ لوگ ۱۵/اگست کی کچھ خاص تیاریاں کریں آزادی کے اس تہوار کو منانے کا نیا طریقہ ڈھونڈیں۔اس میں زیادہ سے زیادہ لوگ شرکت کریں اور ۱۵/اگست لوگوں کا تہوار کیسے بنے اس کی فکر ضرور کریں۔'(۳)

محترم وزیر اعظم نریندر مودی جی کی فکر یقینا ًملک کے لیے ان کی گہری انسیت ومحبت کی آئینہ دار ہے، ماضی، حال اور مستقبل پر ان کی گہری نظر ہے، انگریزوں بھارت چھوڑو، کا نعرہ اپنے اندر ہندوستان کی آزادی کے لیے دی گئی قربانیوں کی تاریخ سمیٹے ہے جب ہر ہندوستانی نے مادرِ وطن کو غلامی کی زنجیروں سے نکالنے کا عزم لیا۔یہ ایک غیر معمولی اور نہایت جرأت آمیز قدم تھا، انگریزوں کے جبر واستبداد اور ظلم وستم نے ساری حدیں پار کر رکھی تھیں کیونکہ 'سونے کی چڑیا' کہے جانے والے ملک کو وہ کسی صورت آزاد نہیں کرنا چاہتے تھے۔جناب مودی جی آج ہر ہندوستانی کے دل میں آزادی کے متوالوں کی طرح حبّ وطن کا جذبہ بیدار کرنا چاہتے ہیں اور اگر اس کی بنیاد نئی نسل میں بچپن سے رکھ دی جائے تو زمانہ مستقبل میں ہمارے بچے اور ہمارے گھر وطن کی محبت میں سرشار ہوں گے اسی لیے مودی جی یوم آزادی کے جشن کی صورت میں قوم اور نئی نسل کے دل میں یہ احساس جگانا چاہتے ہیں کہ

دیکھو کہیں برباد نہ ہووے یہ بغیچہ
اس کو ہردے کے خون سے باپو نے ہے سینچا
رکھا ہے یہ چراغ شہیدوں نے پال کے
اس دیش کو رکھنا مرے بچوں سنبھال
دنیا کے داؤ پیچ سے رکھنا نہ واسطہ
منزل تمھاری دور ہے لمبا ہے راستہ
بھٹکا نہ دے کوئی تمھیں دھوکے میں ڈال کے
اس دیش کو رکھنا مرے بچوں سنبھال کے
ایٹم بموں کے زور پہ اینٹھی ہے یہ دنیا
بارود کے ایک ڈھیر پہ بیٹھی ہے یہ دنیا
تم ہر قدم اٹھانا ذرا دیکھ بھال کے
اس دیش کو رکھنا مرے بچوں سنبھال کے
آرام کی تم بھول بھلیاں میں نہ بھولو
سپنوں کے ہنڈولوں پہ مگن ہوکے نہ جھولو
اب وقت آگیا ہے مرے ہنستے ہوئے پھولوں
اٹھو چھلانگ مار کے آکاش کو چھولو
تم گاڑ دو گگن پہ ترنگا اچھال کے
اس دیش کو رکھنا مرے بچوں سنبھال کے

چنانچہ اب اپنے وطن کی شان وشوکت اور رعب ودبدبہ کو باقی رکھنا ہم سب کا فرض ہے۔آیئے ہم سب یہ عہد کریں کہ ۷۳ ویں یوم آزادی کے اس مبارک موقع پر ہم امسال اپنے محلے، پڑوس، ملنے جلنے والوں، دوستوں، عزیزوں کو یومِ آزادی کی اہمیت بتائیں گے انھیں ان شہیدوں کی یاد دلائیں گے جنھوں نے آزادی کی خاطر اپنی جانیں قربان کردیں تاکہ کل اگر کوئی پوچھے کہ منگل پانڈے، شہید بھگت سنگھ، اشفاق اللہ خاں، رام پرساد بسمل کون تھے؟ تو ہم شرمندگی کا شکار نہ ہوں کہ ہمیں نہیں پتہ، بلکہ ہونا یہ چاہیے کہ ہم ان کے ساتھ سیکڑوں مجاہدانِ آزادی کا نام بتادیں۔اپنے اسکول اور کالجز میں 'نکڑ ناٹک' کرائیں اور ہر برس شہیدوں کی قربانیوں کا ذکر کرکے اس عہد کی یاد تازہ کریں کہ جب ہم نے یہ عزم لیا تھا۔

ہے جوئے شیر ہم کو نور سحر وطن کا
آنکھوں میں روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشک مہر ذرہ اس منزل کہن کا
ملتا ہے برگ وگل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد وغبار یاں کا خلوت ہے اپنے تن کو
مرکر بھی چاہتے ہیں خاک وطن کفن کو
(خاک ہند، چکسبت)

۱۔ نیا دور لکھنؤ، مارچ، اپریل ۱۹۹۵ء، ص ۳
۲۔ نیا دور لکھنؤ، مارچ، اپریل، مئی ۱۹۹۵ء، ص ۳
۳۔ بحوالہ اودھ نامہ لکھنؤ۔پیر ۲۹/جولائی ۲۰۱۹

❑❑❑

شارب ردولوی کی خاکہ نگاری

ڈاکٹر عرشیہ جبین

ایسوسی ایٹ پروفیسر

شعبۂ اردو

یونیورسٹی آف حیدرآباد

رابطہ: 7889602267

شارب ردولوی اردو ادب کے ایک معتبر ناقد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے تخلیق کار بھی ہیں انھوں نے نثری تخلیقات خصوصاً خاکہ اور رپورتاژ میں اپنی تخلیقی صلاحتیوں کے جوہر دکھائے ہیں۔اردو ادب میں خاکہ نگاری کے جو ابتدائی نمونے ملتے ہیں ان میں فرحت اللہ بیگ کے خاکے ''نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی'' کو اہمیت حاصل ہے ان کے بعد کے لکھنے والوں میں خواجہ حسن نظامی، آغا حیدر حسن، مولوی عبدالحق، شاہد احمد دہلوی، اشرف صبوحی، رشید احمد صدیقی، سردار دیوان سنگھ مفتون، جوش ملیح آبادی، خواجہ محمد شفیق دہلوی، مالک رام، شوکت تھانیوی اور فکر تونسوی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

شارب ردولوی نے بھی خاکہ نگاری کی طرف توجہ کی ہے انھوں نے یوں تو کئی خاکے لکھے ہیں۔لیکن ان کے دستیاب شدہ خاکوں میں ایک درویش انقلابی: نیاز حیدر، مونس بھائی (پروفیسر مونس رضا) یاور مہدی حسن عابد، آغا سہیل، عارف نقوی اور یادان کی اتنی خوب نہیں (شمیم نکہت)'' اہمیت کے حامل خاکے ہیں۔ان کے خاکوں کی خاص بات یہ ہے کہ یہ تمام خاکے شخصیت سے بھرپور واقفیت اور قریبی تعلقات کی بنا پر لکھے گئے ہیں۔ان خاکوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں کے خاکوں کے فنی تقاضوں کا بھرپور خیال رکھا ہے۔یعنی شخصیت سے اپنے مراسم کا ذکر ہو یا موضوع خاکہ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی بھرپور عکاسی ہو یا ان کی حلیہ نگاری، سیرت و کردار کا بیان ہو یا کسی واقعہ کے ذریعے شخصیت کے اوصاف کا ذکر، غرض وہ اختصار کے ساتھ خوبصورت لفظوں کے ذریعے کسی شخصیت کے خدوخال اور اوصاف کی یوں صورت گری کرتے ہیں کہ شخصیت کی ظاہری و باطنی تصویر ہمارے ذہن میں اجاگر ہوجاتی ہے۔نیاز حیدر ایک اشتراکی لیڈر اور نامور شاعر تھے۔مخدوم محی الدین، راج بہادر گوڑ اور حیدرآباد کے دیگر اشتراکی لیڈروں اور ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں سے ان کے اچھے مراسم تھے۔شارب ردولوی نیاز حیدر کی شخصیت سے بے حد متاثر تھے انھوں نے اپنے خاکے ''ایک درویش انقلابی'' کے عنوان سے نیاز حیدر پر ایک عمدہ خاکہ لکھا ہے۔اس خاکے میں انھوں نے نیاز کی سیرت و کردار کے بعض اہم پہلوؤں کے ذریعے ان کی شخصیت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔نیاز حیدر سے شارب کی پہلی ملاقات ۱۹۵۵ء میں لکھنو میں ہوئی تھی۔موصوف سجاد ظہیر کی دعوت پر ۳/۴/۵ دسمبر کو لکھنو میں طالب علموں کے کنونشن میں تشریف لائے تھے۔

شارب ردولوی اس وقت ایم۔اے کے طالب علم تھے اور مذکورہ کنونشن کے محرک وسکریٹری بھی۔کنونشن کے سبھی مندوبین میں نیاز حیدر پہلے شخص تھے جولکھنو پہلے پہنچ گئے تھے۔کنونشن سے تقریباً ایک مہینہ پہلے نیاز حیدر سے شارب صاحب کی پہلی ملاقات کے تاثرات کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''ایک دن اب تاریخ یاد نہیں لیکن نومبر کی کوئی تاریخ تھی۔ میں جب ساڑھے دس/ گیارہ بجے دن میں بنے بھائی (سجاد ظہیر) کے یہاں پہنچا تو ایک صاحب دھوپ میں کرسی ڈالے بیٹھے زور زور سے بنے بھائی سے باتیں کررہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بنے بھائی نے کہا کہ بھائی نیاز حیدر آگئے کنونشن تو کامیاب ہوگیا۔ دھیرے دھیرے سب ہی لوگ آجائیں گے اور میں خوشی اور حیرت کے ساتھ نیاز حیدر کو دیکھنے لگا اور بچپن میں پڑھی ہوئی ان کی ایک نظم کے مصرعے ذہن میں گونجنے لگے۔

جان ہماری جیسے ان کے داداد کی جاگیر
سے بڑا گمبھیر

یہ نظم میں نے شاہراہ میں پڑھی تھی اور اس کے کئی مصرعے اس وقت یاد تھے۔ یہ نیاز حیدر سے ہمارا پہلا تعارف تھا۔''

آگے ان کے حلیے کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نیاز حیدر سفید کھدر کا کرتا پائجامہ پہنے تھے اس پر سے ایک موٹی سی شال اوڑھے ہوئے تھے۔رنگ کالا لیکن چمکتا ہوا' ذہین اور تیز آنکھیں' کشادہ پیشانی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پیشانی اپنی حد سے تجاوز کر کے نصف سر سے بھی آگے پہنچ گئی تھی کنپٹی اور پشت سر پر بڑے بڑے بال جن میں سفیدی جھانکنے لگی تھی۔کلین شیو' چہرہ' دبلا پتلا جسم' پہلی نگاہ میں متاثر نہ کرنے والی شخصیت لیکن ذرا ہی دیر کی گفتگو کے بعد محسوس ہوا کہ ان سے اچھا تو کوئی دوست ہی نہ ہوگا۔

(خاکہ ایک درویش انقلابی، نیاز حیدر، مسودہ ،فروری ۱۹۹۷ء، بحوالہ شارب ردولوی: شخصیت اور تنقید نگاری، از عرشیہ جبین، ۱۹۹۵ء ص ۲۹۸)

اس پہلی ملاقات کے بعد نیاز حیدر سے ان کی ملاقاتیں روزانہ کا معمول بن گئیں۔اور وہ نیاز حیدر کی شخصیت سے قریب ہوتے چلے گئے۔ نیاز حیدر بے نیاز شخصیت کے حامل تھے۔انہیں اپنی پرواہ قطعی نہیں ہوتی مگر وہ دوسروں پر سب کچھ نثار کردیتے تھے۔ شارب ردولوی ایک واقعہ کے حوالے سے ان کی شخصیت کے اس پہلو پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ خدا پر ایسا یقین رکھنے والا مشکل ہی سے ہوگا۔ اس لئے کہ انہوں نے (نیاز حیدر) ''کل'' کے لئے ایک پیسہ کبھی نہیں رکھا۔ جو پی پائے ..... پی لی ورنہ بوتل بھی بانٹ دی اور پیسے بھی تقسیم کردیتے۔ ایک بار میرے کمرے پر آگئے میں نے انہیں بیٹھالیا۔اس وقت سرخوشی کے عالم میں بھی تھے لیکن میں نے محسوس کیا کہ کوئی بات ہے پھر میری نگاہ پڑی ان کا دو شالہ ان کے کاندھوں پر نہیں ہے میں نے پوچھا نیاز بھائی! دوشالہ کیا ہوا کہنے لگے کچھ نہیں میں امین آباد کی طرف سے آرہا تھا۔عبداللہ کے چائے خانے کے پاس ایک آدمی بالکل پھٹے کپڑوں میں کھڑا کانپ رہا تھا۔میں نے اسے چائے پلائی اور جب اس سے بھی اس کی سردی کم نہ ہوئی تو میں نے اپنی شال اسے اڑھادی پھر کہنے لگے اس ملک میں انقلاب نہیں آسکتا۔ سب آرام سے پڑے سو رہے ہیں اللہ بھی سو رہا ہے۔''

(بحوالہ شارب ردولوی: شخصیت اور تنقید نگاری از عرشیہ جبین، ۱۹۹۵ء ص ۲۹۹)

شارب ردولوی نے اپنے اس خاکے میں نیاز حیدرؔ اور مجازؔ کے گہرے تعلقات اور ان کے ہم پیالہ و ہم نوالہ ہونے کے واقعات کو بھی بیان کیا ہے۔ بالخصوص اسرارالحق مجازؔ کے سانحہ انتقال پر نیاز حیدر کی حالتِ غیر کی جو تصویر کشی کی گئی ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔وہ رقم طراز ہیں:

''۵/ دسمبر کی شام کو ان کا (مجازؔ) انتقال ہوگیا اس سانحہ کا اثر نیاز حیدر پر بہت خراب پڑا۔ وہ کیسے ہی لاپرواہ' لاابالی اور اپنے سے بے نیاز کیوں نہ رہے ہوں ان سب باتوں کے باوجود وہ ایک نارمل انسان تھے لیکن مجازؔ کے انتقال کا ان پر ایسا شدید اثر ہوا کہ وہ عجیب عجیب طرح کی باتیں کرنے لگے یہ بات میں اس لئے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ میں نے مجازؔ کے انتقال سے پہلے کافی دن ان کے ساتھ گزارے ہیں اور مجازؔ کے انتقال کے بعد تقریباً دو سال ان کے بہت قریب رہا ہوں۔مجازؔ کے انتقال پر ان کی حالت یہ تھی کہ آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ جنازے کا ایک پایہ بڑی سختی سے ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا اور کسی طرح اسے چھوڑنے کو تیار نہیں تھے کبھی کچھ کہتے جو سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔''

(بحوالہ شارب ردولوی: شخصیت اور تنقید نگاری، از عرشیہ جبین، ۱۹۹۵ء ص ۲۹۹)

شارب ردولوی نے مشہور شاعر حسن عابد کی شخصیت پر بھی ان کا ایک عمدہ خاکہ لکھا ہے'۔حسن عابد سے بھی شارب ردولوی کے دیرینہ مراسم تھے۔حسن عابد ان کے لکھنؤ کی طالب علمی کے زمانے کے دوستوں میں شامل تھے۔ وہ حسن عابد کی شخصیت سے بے حد متاثر تھے۔ان کی شخصیت میں جس چیز نے انھیں سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کی ہمدردی، خلوص اور محبت تھی۔حسن عابد نہایت ہمدرد اور مخلص آدمی تھے، وہ خود تکلیف میں رہ سکتے تھے لیکن دوسروں کو تکلیف میں دیکھنا انھیں گوارہ نہ تھا۔ شارب ردولوی نے اپنے خاکے میں حسن عابد کا تعارف کراتے ہوئے ان کی شخصیت کے اسی پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔مثلاً لکھتے ہیں:

''ہم لوگوں کے گروپ میں حسن عابد کم سخن تو نہیں تھے لیکن سنجیدہ طالب علموں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ انجمنوں اور سوسائیٹیوں میں ان کا حصہ دور کا یا زیادہ زیادہ مشورہ دینے تک محدود تھا وہ زندہ دل بے حد تھے اور نگارانِ شہر کی فہرست انہیں ازبر تھی۔ بڑے بڑے بال جنھیں کبھی ہاتھوں سے مخصوص انداز سے پیچھے کرتے، جاڑوں میں سیاہ شیروانی، کبھی پیدل اور کبھی پرانی سی سائیکل پر۔ شام کو حضرت گنج اور اس کے بعد نوری ہوٹل امین آباد میں تقریباً روز نظر آتے۔ باتیں مجاز کی طرح ذرا دانتوں کو دبا کر جلدی جلدی کرتے۔ دوستوں کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتے۔ یوں تو پورا گروہ ہی تنگ دست تھا لیکن اس کے باوجود جب تک پیسے رہتے، حسن عابد کو انہیں خرچ کرنے یا کسی کو دینے میں کوئی عذر نہ ہوتا تھا جبکہ یہ معلوم تھا کہ دیئے ہوئے پیسے کبھی واپس نہیں ملیں گے لیکن دوسروں کو تکلیف میں کبھی نہیں دیکھ پاتے خواہ ان کا مخالف ہی کیوں نہ ہو ذرا کسی مصیبت میں دیکھا اور دل بھر آیا۔''

(حسن عابد، حسن عابد نمبر ماہنامہ شام وسحر، دسمبر ۱۹۹۶ء، ص ۸۲)

شارب ردولوی کا ایک اور خاکہ ''مونس بھائی'' کے عنوان سے ہے جو پروفیسر مونس رضا کی شخصیت پر ہے۔ یہ ایک خوبصورت خاکہ ہے۔ اس کی ابتدا میں انہوں نے مونس رضا سے اپنے ذاتی مراسم کا ذکر کرتے ہوئے ان کی محبت وضع داری، گفتگو کے انداز اور اخلاق و کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''مونس بھائی جو تعلیم و تدریس کی دنیا میں پروفیسر مونس رضا کے نام سے مشہور تھے، ہمارے لئے راہی معصوم رضا کے رشتہ سے صرف مونس بھائی تھے۔ راہیؔ میرے دوست تھے اس لئے مونس بھائی مجھ سے محبت کا برتاؤ کرتے تھے ان میں ایک بڑی خوبی تھی جو شاذ و نادر ہی لوگوں میں ہوتی ہے وہ کبھی کسی میں چھوٹے ہونے کا احساس نہیں پیدا ہونے دیتے وہ خواہ عام بات چیت ہو یا کوئی علمی و ادبی مسئلہ۔ اپنی بات کہنے میں بھی وہ اس کا خیال رکھتے تھے کہ دوسرے کو کوئی بات بُری نہ لگے۔ ان کی گفتگو کا انداز ہی ایسا تھا کہ اختلاف کی صورت میں بھی کبھی نہیں ہوا کہ کوئی ان کے پاس دل برداشتہ اٹھا ہو۔''

(مونس بھائی، ماہنامہ نیا دور، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۱۹)

خاکہ کا ایک جز' یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعہ شخصیت کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا جاتا ہے شارب ردولوی نے بھی اپنے خاکوں میں شخصیت کے صفات کے مختلف پہلوؤں کی مختلف واقعات کے ذریعے بڑی عمدگی سے عکاسی کی ہے مثلاً اپنے خاکے ''مونس بھائی'' میں پروفیسر مونس رضا کی شخصیت یہ خوبی تھی کہ وہ حفظ مراتب کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ چھوٹوں کے ساتھ بڑی محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ ان کی شخصیت میں محبت، خلوص و دوستی کو نبھانے کا جو وصف تھا اسے ایک واقعہ کے حوالے سے اجاگر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''بہت دنوں کی بات ہے اب تو اس کی یاد سے بھی بڑا عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ میری پہلی کتاب شائع ہوئی تھی میں بہت خوش تھا جیسے میں نے کوئی بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہو۔

راہی (راہی معصوم رضا) نے عوامی دور میں اس پر تبصرہ کیا اور میری خوب خوب خبر لی مجھے بہت غصہ آیا' یہ اچھی دوستی رہی؟ میں نے بنے بھائی سے شکایت کی۔ انہوں نے بڑے آرام سے کہہ دیا' تم جواب دو یہ تو علمی بحث ہے میں نے جواب دیا جو اتنا ہی سخت تھا وہ بھی عوامی دور میں چھپ گیا راہی سے ملاقات ہوئی تو مونس بھائی بھی تھے ہم لوگوں نے ایک دوسرے کی شکایت کی' ہنسنے لگے کہا: تم لوگوں کی بحث میر انیسؔ پر ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ انیسؔ کو اچھی طرح پڑھا نہیں ورنہ ان کے اس شعر کو کبھی نہیں بھولتے۔

خیال خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

ایسا بے ساختہ شعر سن کر ہم دونوں ہنسنے لگے اور پھر بات زبان کی تہذیبی قدروں پر ہونے لگی۔

(مونس بھائی، ماہنامہ نیا دور، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۲۰)

شارب ردولوی مونس رضا سے بے حد متاثر تھے۔ انھوں نے اپنے اس خاکے میں نہ صرف مونس رضا کی شخصیت کی خوبیوں کا ذکر کیا بلکہ ان سے اپنے قریبی تعلقات کا اظہار بھی کیا ہے۔ مونس رضا کے انتقال کر جانے سے ان کے دل پر جو صدمہ ہوا اس کا ذکر بھی ان کے اس خاکے میں بڑے موثر پیرائے میں ملتا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''۱۹۹۴ء میں ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ شروع میں دہلی ہی میں علاج ہوتا رہا۔ جب کوئی فائدہ نہیں ہوا تو اپنے بیٹے بیٹی کے پاس امریکہ چلے گئے جہاں ان کی بیٹی ڈاکٹر ہے وہاں کے علاج سے انہیں بہت فائدہ ہوا۔ شہلا آپا نے بتایا۔ ''اب بہت اچھے ہیں اور دوستوں کے خطوں اور کتابوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ کسی کا خط یا کوئی کتاب آجائے تو بہت خوش ہوتے ہیں تم ان کو لکھو'' مجھے بہت خوشی ہوئی۔ لیکن یہ خوشی زیادہ دنوں باقی نہیں رہی۔ ۱۸/ جولائی ۱۹۹۴ء کو امریکہ ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ آج مونس بھائی نہیں ہیں لیکن ان کی باتیں جب یاد آتی ہیں تو ذہن کے گرد رنگین ہالے سے بنتے چلے جاتے ہیں اور تادیر ان سے نکلنا مشکل ہوجاتا ہے۔''

(مونس بھائی، ماہنامہ نیا دور، جولائی

۱۹۹۸ء،ص ۲۲)

شارب ردولوی کے خاکوں میں فنِ خاکہ کی تمام خصوصیات ملتی ہیں انہوں نے نہ صرف خاکہ نگاری کے اصولوں کو ملحوظ رکھا بلکہ غیر جانبداری سے شخصیتوں کی خوبیوں کے علاوہ خامیوں کو بھی ہمدردی سے پیش کیا۔ان کے خاکے شخصیات سے محض ایک دو ملاقاتوں پر منحصر نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنے خاکے شخصیت سے بھرپور واقفیت کے بعد ہی لکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے خاکوں کے مطالعے سے ہمیں یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہم ان شخصیات سے بخوبی واقف ہیں یا ہم ان سے پہلے بھی مل چکے ہیں۔

شارب ردولوی کو زبان و بیان پر بھرپور قدرت حاصل ہے۔انھوں نے شخصیت کی تصویر کشی کے لئے اپنے خاکوں کو ایسی زبان عطا کی ہے جو قاری کے دل کو چھوتی ہے اور قاری متاثر اور لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا۔خصوصاً اُن کے خاکوں میں زبان و بیان کی لطافتوں کا احساس اس وقت بڑھ جاتا ہے جب وہ کسی کیفیت یا ماحول کی منظر کشی کرنے لگتے ہیں۔مثال کے طور پر ان کے خاکے ''حسن عابد'' کا ابتدائیہ ملاحظہ ہو جس میں وہ اپنے زمانۂ طالب علمی کے لکھنؤ کا ذکر کرتے نظر آرہے ہیں:

''وہ جنوں کے رنگ لانے کے دن بھی تھے سارا لکھنؤ جیسے مہک رہا تھا معلوم نہیں رنگ ونکہت کا یہ جوش شفق کے حسن و رنگ کی طرح غروب آفتاب کی علامت تھا یا کچھ اور لیکن وہ رنگ پھر دیکھنے میں نہ آیا جیسے جانے والے اسے بھی سمیٹ لے گئے۔اس وقت لکھنو شہر نگاراں تھا شہر ادب تھا اس کا ہر شعبہ اپنی رعنایوں کے عروج پر تھا یونیورسٹی ،حضرت گنج، امین آباد اور وکٹوریہ اسٹیرٹ اس کے عناصر اربع تھے اور شعر و شاعری مشاعرے نشستیں اور مباحثے ان عناصر کی روح۔ نو واردان کوچۂ دلدار غزلوں کے سہارے اس تک اپنی پہنچاتے:

نظم اور غزل لکھنا بزم شعر میں جانا
اسی سے بات کرنے کا ایک یہ بہانا تھا

(حسن عابد، ماہنامہ شام وسحر، اردو بازار لاہور، مدیر شیخ صفدر علی، ۱۹۹۶،ص ۷۹)

اس اقتباس سے زبان و بیان پر ان کی بھرپور قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ان کے بیشتر خاکوں میں دلکش نثر کی خوبیاں جگہ جگہ ملتی ہے۔شارب ردولوی کے اکثر خاکے ان احباب کے ہیں جن کا تعلق لکھنؤ یونیورسٹی کے زمانے سے رہا ہے۔یاور مہدی لکھنؤ یونیورسٹی کے انہیں احباب میں تھے۔یاور مہدی کی شخصیت پر بھی شارب ردولوی نے بہترین خاکہ لکھا۔اس خاکے کی خاص بات ہے کہ اس خاکے میں نہ صرف ہمیں شخصیت سے بھرپور تعارف ہوتا ہے بلکہ اس عہد کا لکھنو،لکھنو کے تعلیمی اداروں اور ادبی سرگرمیوں،ادبی شخصیات اور لکھنو کی ادبی محفلوں کی ایسی مرقع کشی کی گئی ہے کہ پورا لکھنو جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔اس خاکے میں ہمیں اس عہد کے لکھنو کی تہذیب اور وہاں کے ادبی ماحول کی بڑی حسین تصویریں ملتی ہیں خصوصاً اس عہد کے لکھنو یونیورسٹی کی عمارت کی منظر کشی اس عمدگی سے کی گئی ہے کہ جس نے لکھنؤ یونیورسٹی کی قدیم عمارت نہ دیکھی ہو وہ اس کی ہو بہ تصویر دیکھ لے۔مثلاً:

''لکھنؤ یونیورسٹی کی خوب صورت اور نازک برجوں والی عمارت کی پہلی منزل کے مشرقی گوشے کے ایک بڑے کمرے میں شعبہ اردو تھا جس کے دونوں طرف کشادہ ،خوب صورت اور طویل برآمدے تھے۔شعبہ اردو کے ایک طرف آبنوسی رنگ کی لکڑی کا بہت خوب صورت چوڑا زینہ اور دوسری طرف ایک لمبا کمرا جس میں فارسی کے کلاس ہوتے تھے اور جس میں عام طور پر ڈاکٹر نذیر احمد صاحب بیٹھے اپنے طالب علموں کا انتظار کرتے تھے۔شعبہ اردو کے سامنے عمارت کے مغربی حصے کو جوڑنے والی کھلی ہوئی چھت تھی جہاں سے یونیورسٹی کا وسیع میدان، نیچے کے کلاس روم، ڈیپارٹمنٹ اور خاص طور پر جامن کے پیڑ کے برابر چھتوں والا وہ کمرا جو لڑکیوں کا کامن روم تھا ،دکھائی دیتا تھا یہ کھلی چھت شعبۂ انگریزی اور شعبۂ تاریخ کو شعبۂ اردو و فارسی شعبہ عربی اور شعبۂ سنسکرت سے جوڑتی تھی اور ہر گھنٹے پر پچاسوں طلبا و طالبات اپنے ایک کلاس سے نکل کر دوسرے کلاس میں جانے کے لیے اسی چھت پر سے گزرتے اور لالہ وگل کے ساتھ پیرہن کی رنگینیوں کا بھی لطف اٹھاتے۔''

(یاور مہدی، اویس ادیب انصاری، نائر جاوداں، اوکھائی پریس، کراچی، ۱۹۹۸ء، ۱۸۲)

شارب ردولوی کے خاکوں کی منظر کشی کے خوبصورت نمونے جگہ جگہ ملتے ہیں ۔شارب ردولوی کا یہ خاکہ نہ صرف منظر کشی کی دلکش مثالیں پیش کرتا ہے بلکہ اس عہد کی بڑی قدآور شخصیتوں سے بھی تعارف کرواتا ہے۔شارب ردولوی نے اس خاکے خاکے میں یاور مہدی سکی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی بڑی عمدہ عکاسی کی ہے خصوصاً ان کی شخصیت کے جس پہلو سے وہ زیادہ متاثر تھے وہ دوستی نبھانے کی صفت تھی۔کیوں کہ یاور مہدی کی شخصیت میں یہ خوبی تھی کہ وہ دوستی نبھانے کے معاملے میں بڑے سخت تھے وہ دوستوں کے لیے کچھ بھی کر جانے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ان کیصفت شارب ردولوی کو بڑی عجیب معلوم ہوئی۔انھوں نے ان کی شخصیت کی اس خوبی کی عکاسی بڑی عمدگی سے کی ہے مثلاً لکھتے ہیں:

''میری لکھنؤ کی یادوں میں یاور مہدی کی شخصیت بھی بڑی عجیب وغریب ہے۔آپ کسی ایسے خوب صورت، دراز قد، شگفتہ رو، پرکشش شخص کا تصور کر سکتے ہیں جو آپ سے کسی بات کا مطالبہ نہ کرے، مطالبہ تو دور رہا کسی خواہش کا اظہار بھی نہ

کرے اور ہر وقت ہر جگہ آپ کے ساتھ موجود رہے اور ہر کام میں اس طرح مدد کرے جیسے اس کا اپنا کام ہو جو کبھی کسی بات کا نہ برا مانے نہ لڑے اور نہ خفگی کا اظہار کرے لیکن بات نقطۂ نظر کی آجائے یا دوستی زد میں ہو تو اتنا سخت ہو جائے کہ کوئی جھکا نہ سکے۔ یاور کے بارے میں کبھی سوچتا ہوں تو غالبؔ کا یہ شعر ذہن میں گردش کرنے لگتا ہے:

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں

اور میں حیرت زدہ آنکھوں کے ساتھ انھیں راستوں پر بھٹکنے لگتا ہوں۔''

(یاور مہدی، اویس ادیب انصاری، نائر جاوداں، اوکھائی پریس، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۸۰)

یاور مہدی کے کراچی، پاکستان چلے جانے کا یا دوستوں سے بچھڑ جانے کا دکھ شارب ردولوی کو ہمیشہ رہا۔ یاور مہدی سے ان کی ملاقات جب دوبارہ کراچی میں ہوئی تو اس وقت ان کا کیا تاثر رہا ملاحظہ کیجیے:

''کراچی میں میری ملاقات ایک نئے یاور مہدی سے ہوئی جس کے پاس ہماری مشترکہ یادیں تو ضرور تھیں لیکن باقی سب بدل چکا تھا اور بہت کچھ اس چشمے کے پیچھے چلا گیا تھا جس کا ذکر شمیم نے کیا۔ اب بڑے بڑے کمروں اور دالانوں والا اس کا مکان تھا خود اس سے زیادہ خوب صورت اس کی بیوی اور اس کے برابر کے اس کے بیٹے اور بیٹیاں تھیں سب کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے کسی ایسے باغ میں پہنچ گیا ہوں جس کا پہلے کبھی تصور نہ کیا ہو لیکن یاور میں ذاتی تبدیلی دور دور تک نظر نہیں آئی۔ وہی مخلص، سادہ سا لکھنو والا یاور۔۔۔ وہی بات بات میں ہنس پڑنا، کسی مشکل کو مشکل نہ سمجھنا، دوستوں کے لیے جان دینے پر تیار، اس قدر وسیع الاخلاق بلکہ وسیع الاحباب کہ سارا شہر ان کے دوستوں میں، چھوٹا ہو یا بڑا ہر ایک سے ان کی ملاقات۔ یہی سبب تھا کہ کوئی کام ہو، کسی سے نہ ہو پا رہا ہو تو یاور سے کہو تھوڑی دیر میں ہو جائے گا۔''

(یاور مہدی، اویس ادیب انصاری، نائر جاوداں، اوکھائی پریس، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۸۴)

شارب ردولوی نے اپنے خاکوں میں شخصیات کی حلیہ گفتگو چال ڈھال عادات و اطوار مزاج، پسند ناپسند اور ان کی طرز زندگی کو لطیف انداز بیان کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری کے سامنے اس شخص کی تصویر کا ہو بہو نقشہ آجائے یہی وجہ ہے کہ ان کے خاکوں کے ذریعے قاری یوں محسوس کرتا ہے کہ اس شخص سے اس کی پہلے ہی سے شناسائی ہے۔

شارب ردولوی کے خاکوں میں ایک اہم خاکہ ان کی اہلیہ شمیم نکہت کا ''یاد اس کی اتنی خوب نہیں'' کے عنوان سے ہے۔ یہ خاکہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کے ذریعے شارب ردولوی کے اپنی شریک حیات سے خوشگوار ازدواجی تعلقات، ان سے گہری وابستگی، محبت اور قلبی جذبات و احساسات کی حسین تصویریں ملتی ہیں۔ انھوں نے اس خاکے میں شمیم نکہت کی عادتوں میں شمیم نکہت کوئی کام لیتیں تو اسے انجام دیے بغیر نہ چھوڑتیں تھیں۔ وہ افسانے لکھنے کا معاملہ ہو یا کوئی دوسرا کام وہ اپنے مقررہ وقت پر اسے کر لیتی تھیں۔

شارب ردولوی نے اپنے خاکوں میں شخصیات کی حلیہ گفتگو چال ڈھال عادات و اطوار مزاج، پسند ناپسند اور ان کی طرز زندگی کو لطیف انداز بیان کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری کے سامنے اس شخص کی تصویر کا ہو بہو نقشہ آجائے یہی وجہ ہے کہ ان کے خاکوں کے ذریعے قاری یوں محسوس کرتا ہے کہ اس شخص سے اس کی پہلے ہی سے شناسائی ہے۔

شارب ردولوی کے خاکوں میں ایک اہم خاکہ ان کی اہلیہ شمیم نکہت کا ''یاد اس کی اتنی خوب نہیں'' کے عنوان سے ہے۔ یہ خاکہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کے ذریعے شارب ردولوی کے اپنی شریک حیات سے خوشگوار ازدواجی تعلقات، ان سے گہری وابستگی، محبت اور قلبی جذبات و احساسات کی حسین تصویریں ملتی ہیں۔ انھوں نے اس خاکے میں شمیم نکہت کی عادتوں، ان کی پسند ناپسند کے علاوہ ان کی بہادری، خودداری، ملنساری، اور وقت کی پابندی جیسی صفات کا ذکر بڑی عمدگی سے کیا ہے۔

شمیم نکہت کوئی کام لیتیں تو اسے انجام دیے بغیر نہ چھوڑتیں تھیں۔ وہ افسانے لکھنے کا معاملہ ہو یا کوئی دوسرا کام وہ اپنے مقررہ وقت پر اسے کر لیتی تھیں۔ ان کی مزاج کے اس وصف کا ذکر کرتے ہوئے شارب ردولوی لکھتے ہیں:

''شمیم کا مزاج تھا کہ وہ جو کچھ طے کر لیتی تھیں اسے کرنے سے انھیں کوئی روک نہیں سکتا تھا لیکن ان کی یہ سختی خود اپنے اور میرے معاملے میں ہوتی تھی، باہر والوں سے نہیں۔ وہ عام طور پر افسانے یا مضامین رات میں لکھتی تھیں، نہ لیٹ سکتی تھیں۔ یہ اکثر ہی ہوتا تھا کہ انھیں ریڈیو کے لیے کوئی ٹاک یا افسانہ لکھنا ہے، صبح ریکارڈنگ ہے رات میں لکھنے بیٹھتیں۔ گیارہ بجے تک میں بھی پڑھتا لکھتا، اس کے بعد میں کہنا شروع کر دیتا کہ اب اسے بند کرو، صبح مکمل کرنا۔ ریکارڈنگ گیارہ بجے ہے بہت وقت رہے گا۔

سر اٹھائے بغیر جواب دیتیں:

''آپ سو جائیں، میں مکمل کر کے سو جاؤں گی''۔ اور میں سو جاتا تھا۔ صبح دیکھتا نہ صرف یہ کہ انھوں نے افسانہ مکمل کر لیا بلکہ اس کی

فیئر کاپی بھی وہاں جمع کرنے کے لیے تیار کر لی۔ وہ افسانے بہت لکھتی تھیں ان کے افسانے ہندی اور پنجابی میں بھی شائع ہوئے لیکن کتاب کی اشاعت اور اپنی تحریر کے شور شرابے اور دکھاوے میں انھیں ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی۔''

(یاد اس کی اتنی خوب نہیں ،تاثر وتنقید :شمیم نکہت کی یاد میں ،حسامی بک ڈپو،مچھلی کمان حیدرآباد،۱۹۹۷ء،ص۱۹)

انہوں نے غیر جانبداری سے شمیم میڈم کی ایک ایک خصوصیت کا اختصار کے ساتھ یوں احاطہ کیا کہ ان کی تصویر ہو بہو جیتی جاگتی چلتی پھرتی ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہے ۔شمیم میڈم کی ایک عادت یہ تھی کہ وہ سوتے وقت شارب صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سوتی تھیں ۔ان کی اس عادت کا ذکر کرتے ہوئے کے شارب صاحب نے انتہائی درد بھرے اور جذباتی انداز میں ان کے سانحۂ ارسال کے واقعہ کا تذکرہ کیا ہے کہ قاری بھی اس درد میں ان کا برابر کا شریک ہوجاتا ہے۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''ان کی ایک عادت تھی میرا ہاتھ لے کر سوتی تھیں۔اگر اتفاق سے میں کوئی کتاب پڑھنے لگا یا دوسری طرف کروٹ لے لی تو بالکل بچوں کی طرح ناراض ہوتیں۔

''آپ کو یہ بھی خیال نہیں ہے ایک کتاب اٹھالی اور بس اتنا بھی خیال نہیں ہے۔ہاتھ ادھر لائیے''اور میں جلدی سے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا اور وہ آرام سے سوجاتیں۔

۲۸ ستمبر کو شاید شام ساڑھے ۶ بجے انہوں نے پیتھالوجی سے اپنی رپورٹ لانے کو کہا جبکہ میں خود کبھی رپورٹس لینے نہیں جاتا تھا۔اسی بہانے وہ مجھے ہٹانا چاہتی تھیں۔ان کی سب سے چھوٹی بہن یاسمین انجم جسے بیٹی کی طرح چاہتی تھیں وہ ان سے ملنے کے لیے آئی تھیں۔ان کے لیے انھوں نے چائے بنوائی۔دونوں باتیں کررہی تھیں اور چائے پی رہی تھیں کہ اچانک طبیعت خراب ہوئی اور ذرا دیر میں انھوں نے آنکھیں بند کر لیں مجھے آواز بھی نہیں دی کہ شارب ہاتھ لائیے مجھے نیند آرہی ہے۔''

(یاد اس کی اتنی خوب نہیں ،تاثر وتنقید: شمیم نکہت کی یاد میں ،حسامی بک ڈپو،مچھلی کمان حیدرآباد،۱۹۹۷ء،ص۲۲)

شارب ردولوی کے خاکوں کے مطالعے سے ذہن میں یہی تاثر ابھرتا ہے کہ وہ اپنے خاکوں میں موضوع خاکہ کی شخصیت کے مختلف اوصاف کو اس کے اصلی رنگ وروپ میں پیش کرتے ہیں۔شخصیت کی شکل وصورت، اخلاق و عادات ،اعمال و افعال ،اس کی خوبیاں وخامیاں سب کو حقیقت نگاری کے ساتھ اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔وہ اختصار و جامعیت کے ساتھ شخصیت کی صفات کے مختلف گوشوں کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں کہ اس کی شخصیت کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہو پاتا،وہ موضوع خاکہ کی زندگی کے صرف چند اہم واقعات کے ذریعے اس کی سیرت وسراپے کے چند خطوط کو بڑے دلچسپ وموثر انداز میں ابھارتے ہیں کہ شخصیت کی ہو بہو تصویر نظروں میں رقص کرنے لگتی ہے،وہ نہ صرف کسی کیفیت وحالت کی بہترین تصویر کشی کرتے ہیں بلکہ شخصیت سے تعلق رکھنے والے واقعات اور ماحول کی بھی بہترین منظر کشی کرتے ہیں جس سے سارا ماحول ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔شروع سے آخر تک ان کے خاکے میں ایک خاص تاثر دکھائی دیتا ہے جس کی وجہ سے قاری آخر تک ان خاکوں کو پڑھے بغیر نہیں رہ پاتا۔غرض شارب ردولوی اپنے خاکوں کو اختصار،سچائی ،مرقع کشی،اظہار کی جرأت،غیر جانبداری،کردار نگاری ،واقعہ نگاری ،منظر کشی ،شگفتہ ولطیف انداز بیان ، شخصیت کی باطنی وظاہری خصوصیات کے بیان کے ساتھ ساتھ وحدت تاثر کو معروضی ومعتدل انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ مذکورہ شخصیت اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی نظر آنے لگتی ہے۔

❑❑❑

'نیا دور' کو ایسی ادبی تخلیقات کا شدت سے انتظار ہے جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہوں۔ایسی تخلیقات جو اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عام قاری کی دلچسپی سے عاری ہوں تو اسے 'نیا دور' اپنی اشاعتی ترجیحات میں شامل کرنے سے گریز کرے گا کیونکہ معاملہ دراصل اردو کے فروغ کا ہے۔اردو محض یونیورسٹیوں کے شعبوں،تحقیقی اداروں اور دیگر اردو مراکز تک اپنی مخصوص ضرورتوں کے تحت محدود رہے،اس روش سے بہرحال پرہیز کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ہم سب کا اولین فریضہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں پوری تندہی کے ساتھ شامل رہیں اور عام قاری سے اردو کے مراسم کو استوار کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔تخلیق کا غیر مطبوعہ ہونا لازمی شرط ہے۔تخلیق کے ساتھ اپنی تصویر،ٹکٹ لگا ہوا لفافہ معہ پتہ اور بینک اکاؤنٹ نمبر،آئی۔ایف۔ایس۔سی۔،برانچ کوڈ والا Cancelled Cheque بھی ضرور ارسال کریں۔**مصنف کے بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات کے بغیر حاصل ہونے والی تخلیقات کسی بھی صورت میں شائع نہیں کی جائیں گی کیونکہ اس کے سبب ہی دیگر تخلیق کاروں کے اعزازیہ میں غیر ضروری تاخیر ہوتی ہے۔بغیر بینک تفصیلات کے تخلیقات ارسال کرنے والے اعزازیہ کے حقدار نہیں ہوں گے۔**

کرشن چندر کی ناول نگاری اور ترقی پسند تحریک

محمد پروین خان

ریسرچ اسکالر

الٰہ آباد یونیورسٹی

الٰہ آباد

رابطہ: 9696150910

کرشن چندر اپنے عہد کے ایک عظیم فنکار ہیں۔اردو فکشن کی تاریخ میں جابہ جا بکھری ہوئی ان کی تخلیقات ان کی عظمت کی گواہ ہیں۔نہ صرف اردو افسانوں میں بلکہ اردو ناولوں کو بھی انہوں نے نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کیا۔کرشن چندر بنیادی طور پر حقیقت پسند فکشن نگار ہیں لیکن ان کی یہ حقیقت پسندی رومان کے سہارے پروان چڑھتی ہے۔کرشن چندر کی بہترین تخلیقات میں انہیں افسانوں اور ناولوں کا شمار ہوتا ہے جس میں بے لاگ حقیقت نگاری ان کی رومانیت اور جذباتیت انسان دوستی پر غالب ہیں ساتھ ہی طنز کے زہریلے تیر بھی جابہ جا نظر آتے ہیں۔تلخ اور شیریں کا یہ حسین امتزاج زندگی کو اس کے اصل روپ میں دیکھنے والی بے لوث نظر اور حقیقت نگاری کا خوب صورت استعمال کرشن چندر کو ایک کامیاب فنکار بناتا ہے۔کرشن چندر نے جس دور میں لکھنا شروع کیا وہ دور نہ صرف ہندوستان کے لئے بلکہ عالمی سطح پر پوری دنیا کے لئے سیاسی وسماجی انتشار کا دور تھا کہ ایک طرف جہاں عالمی سطح پر دوسری جنگِ عظیم کی آہٹ محسوس کی جارہی تھی،وہیں ہندوستان میں آزادی کے متوالے اپنے اس محبوب ملک کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لئے ہر لحہ کوشاں تھے،ملک میں پھیلی اس بدامنی کا احساس آزادی کے علم برداروں کے ساتھ ہی یورپ کے ممالک میں زیرِ تعلیم کچھ ہندوستانی نوجوانوں کو بھی تھا جن میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، جیوتی گھوش اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر سرِ فہرست تھے۔اب چونکہ یہ تمام نوجوان بیرونی ممالک میں زیرِ تعلیم تھے اور تحریکِ آزادی میں براہِ راست حصہ لینا ممکن نہ تھا لہٰذا ان تمام لوگوں نے مل کر لندن میں ہی ایک انجمن کا خاکہ تیار کیا جس کے تحت شعروادب کی تخلیق کے لئے کچھ اصول ومقاصد طے کئے گئے اور تعلیم مکمل ہونے تک ملک کے بیشتر شعراء وادباء سے رابطہ قائم کرانہیں اصول ومقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر ادب کی تخلیق پر زور دیا جاتا رہا۔ حصولِ تعلیم کے بعد جب یہ نوجوان ہندوستان آئے تو انہیں منصوبوں کے تحت ملک بھر کے قلم کاروں کے پاس انجمن کے اعلان نامے کو بھیج کر ان کا تعاون مانگا گیا اور بالآخر اپریل ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ کے رفاہ عام حال میں ترقی پسند ادبی تحریک کی پہلی کانفرنس اردو کے عظیم فنکار منشی پریم چند نے کی صدارت میں ہوئی،جس میں اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستانی ادبیات کو فرسودگی، کہنگی، تعطل اور بے مقصدیت کے ماحول ومزاج سے باہر نکالا جائے اور انسان دوستی کے جذبے کے ساتھ عوام کے دکھ سکھ کو براہِ راست ادب کا موضوع بنایا جائے۔

اس ترقی پسندانہ میلان نے رفتہ رفتہ تمام اصناف ادب کو متاثر کیا۔ادیبوں اور شاعروں کے سامنے موضوعات کا ایک جہانِ تازہ آ گیا۔انہوں نے ہندوستانی عوام کے معاملات ومسائل پر توجہ کی۔جس کے لازمی نتیجہ کے طور پر با مقصد ادبی شعور پروان چڑھنے لگا۔اس وقت تک ہندوستان کی تحریکِ آزادی بھی اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو چکی تھی ،عدم تعاون اور غیر ملکی چیزوں کے انقطاع کی تحریکیں عوامی زندگی کو متاثر کر رہی تھیں۔انگریز حاکموں،ان کے وفادار زمینداروں اور سرمایہ داروں کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ ہندوستانی عوام کا استحصال اب اس حد تک ممکن نہیں۔ملک کا ہر فرد انگریزوں کی حکمتِ عملیوں کے برخلاف بیدار ہو چکا تھا،چنانچہ ان بیدار نوجوانوں نے فرسودہ روایات کے برخلاف نئی قدروں کو اختیار کرنے کی جانب اپنے اقدام بڑھانے شروع کر دئے تھے،ملک بھر میں تیزی سے پھیل رہی بیداری کی اسی لہر کے درمیان ہی کرشن چندر اردو فکشن کی دنیا میں نمودار ہوئے اور مختلف موضوعات کے تحت کم وبیش 48 ناول تخلیق کئے جن میں 'شکست'(1943)'جب کھیت جاگے' (1952)'طوفان کی کلیاں'(1954)' آسمان روشن ہے'(1957) 'غدار'(1960)'ایک گدھے کی سرگزشت' (1957)'میری یادوں کے چنار' (1962) اور' ایک وائلن سمندر کنارے' (1963)وغیرہ قابلِ ذکر ہیں،لیکن ان کے وہ ناول جن میں ترقی پسند افکار ونظریات کی بھرپور عکّاسی ملتی ہے وہ ان کا پہلا اور شاہکار ناول' شکست' کے علاوہ' جب کھیت جاگے'اور'طوفان کی کلیاں' ہیں۔

ناول' شکست' سجاد ظہیر کے ناول 'لندن کی ایک رات' کے بعد ترقی پسند ناول نگاری کی دوسری اہم کڑی مانا جاتا ہے۔جو ان کا پہلا اور ناولوں میں سب سے معروف ومقبول ناول بھی ہے۔یہ ناول 1936ء سے 1947ء کے درمیان شائع ہونے والے ترقی پسند ناولوں میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔' شکست' اپنے موضوع اور مسائل کے اعتبار سے نیا نہیں لیکن کرشن چندر کے خاص اسلوب کی بدولت ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کا نقطۂ عروج ضرور کہا جا سکتا ہے۔بقول وقار عظیم:

''لندن کی ایک رات' کے بعد سات برس تک کوئی ایسا ناول نہیں لکھا گیا، جسے فنی حیثیت سے کوئی امتیازی جگہ دی جا سکے۔ ۱۹۴۳ء میں کرشن چندر کا شکست شائع ہوا اور اس کے متعلق پڑھنے والوں میں متضاد رائیں پھیلیں بہت اچھی بھی، بہترین بھی۔لیکن وہ ایک ایسی چھوٹی سی دنیا ہے جو ہمیں تھوڑی دیر کے لئے صرف اپنا بنا لیتی ہے اور ہم اس میں کھو جاتے ہیں۔،،

(ترقی پسند اردو ناول:از ڈاکٹر انور پاشا۔صفحہ ۸۹)

شکست طاقتور کے ہاتھوں کمزور کے استعمال کے خلاف بغاوت کا حوصلہ رکھنے والے نوجوان کی کہانی ہے۔جس میں ناول کے ہیرو شیام کی شکست کو دکھایا گیا ہے۔ناول میں کشمیر کی دیہاتی زندگی کے پس منظر میں عشق ومحبت کی فطری خواہشات اور سماجی رکاوٹوں کی کش مکش اور ٹکراؤ کو بطور موضوع پیش کیا گیا ہے۔جس میں دو کہانیاں باہم چلتی ہوئی اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔ناول میں ایک قصہ شیام اور اس کی محبوبہ ونتی کا ہے۔شیام جہاں ایک تعلیم یافتہ باشعور نوجوان اور علاقائی تحصیل دار کا بیٹا ہے وہیں ونتی دیہات کے عام غریب گھرانے کی سیدھی سادی لڑکی۔اب چونکہ دونوں کی خاندانی اور سماجی حیثیت میں بڑا فرق ہے ایسی صورتیں جبکہ ونتی کی ماں چھایا دیوی کسی زمانے میں ایک مسلم ماسٹر امجد علی سے محبت کے سبب بدنام اور برادری سے نکالی جا چکی تھی۔لہٰذا شیام کی ماں جو کہ علاقائی تحصیل دار کی بیوی ہونے کے سبب سماجی اعتبار سے خود کو معزز مانتی ہے، بیٹے کی مرضی کے خلاف اسکی منگنی کسی دوسری لڑکی سے کر دیتی ہیں۔چنانچہ ان حالات میں شیام کا اپنے خاندان اور سماج سے بغاوت کر پانا محال رہتا ہے۔نتیجتاً ونتی کا ماما ڈھائی ہزار روپیوں کے لالچ میں ونتی کی شادی پنڈت سروپ کشن کے بیٹے درگا داس سے اسکی ماں اور خود ونتی کی مرضی کے برخلاف کر دیتا ہے۔جدائی کا یہ غم ونتی پر بھاری پڑتا ہے اور وہ خودکشی کر لیتی ہے۔

اسی طرح ناول کے دوسرے قصے میں چندرا جو کہ ایک دلت طبقے کی لڑکی ہے، باپ کی موت کے بعد اپنی برہمن ماں کے ہم راہ گاؤں سے نکال دی جاتی ہے۔چندرا ایک غریب طبقے کی لڑکی ضرور ہے لیکن اس میں اپنی ماں سے ملی برہمن کی غیرت اور باپ سے ملا دلت کا صبر وتحمل بھی ہے چنانچہ چندرا گاؤں والوں کی اس بے غیرتی کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے۔جس میں موہن سنگھ جی جان سے اس کا ساتھ دیتا ہے

موہن سنگھ یوں تو راجپوت گھرانے کا چشم و چراغ ہے،لیکن چندرا سے محبت کے سبب ہر لمحہ اس کی فکر کرتا ہے اور چندرا پر بری نظر ڈالنے والے ہر شخص سے اس کا انتقام لیتا ہے،لیکن چونکہ موہن سنگھ اور چندرا دو الگ برادری سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا سماجی بندشوں کے آگے ونتی اور شیام کی طرح چندرا اور موہن سنگھ کی محبت بھی اپنی منزل کو پہنچنے سے قبل ہی دم توڑ دیتی ہے۔سماجی بندشوں کے اصول جہاں چندرا کو دلت تو ونتی کو اس کی ماں کی بدنامی کے سبب انصاف سے محروم کر دیتی ہیں۔چنانچہ والدین کی ضد کے آگے ایک طرف جہاں شیام کے جھک جانے سے ونتی خودکشی کو مجبور ہو جاتی ہے وہیں موہن سنگھ سماج کی فرسودہ روایتوں کے خلاف لڑتے ہوئے ہسپتال میں دم توڑ دیتا ہے۔غرضیکہ عشق کی وادی میں بھٹکتے ہوئے ان چاروں کرداروں کی زندگی سماجی بندشوں اور فرسودہ روایات کے کے سبب ایک ادھورا خواب بن کے رہ جاتی ہے جسے کرشن چندر تعصب،تفریق اور استحصال کی آندھی

سے تعبیر کرتے ہیں۔عزیز احمد 'شکست' کے ان اہم کرداروں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس ناول میں کردار نگاری بھی بہت اچھی ہے، چھایا ، نوراں ، چندرا ان سب میں خصوصیت سے چندرا میں بڑی انفرادیت ہے پام دیو کا کردار گالیوں اور اپنی انسانیت دونوں کی وجہ سے اچھا معلوم ہوتا ہے۔تھانے دار یار محمد پیسے کی نہیں عورت کے جسم کی رشوت چاہتا ہے اور موہن سنگھ وہ غیور راجپوت ہے کہ جو شاید چندرا کے بعد اس ناول کا سب سے جیالا کردار ہے۔علی جو ایک ہندو ریاست کا چھوٹا سا مسلمان عہدے دار جس کا اصلی اور سچا ہم درد ہندو تحصیل دار کا بیٹا شیام ہے جو علی سے سیاست پر بحث کرتا ہے اور قدامت پرستی کی جگہ انسانی اشتراکیت اور اس کے بے تعصبی کے اصول کو سمجھاتا ہے جو اس ناول کی جان ہیں۔''

(ترقی پسند ادب :از عزیز احمد صفحہ:137-38)

یوں تو اس ناول میں فلسفۂ اشتراکیت کی تبلیغ اور طبقاتی تصادم اور جدوجہد کی کارفرمائی اس حد تک دیکھنے کو نہیں ملتی لیکن کرشن چندر نے ناول کے قصے کے ذریعے اپنے مخصوص نقطۂ نظر کی جس طرح وضاحت کی ہے اور ناول کے کرداروں بالخصوص شیام کے ذریعے جس طرح سیاسی، سماجی اور معاشی نظام کی تبدیلی سے متعلق تمام بنیادی مسائل و نظریات کی جانب اشارہ کیا ہے وہ ان کے اشتراکی شعور اور رجحان پر مکمل روشنی ڈالتی ہے۔جو بقول پروفیسر یوسف سرمست:

''شکست میں فرسودہ نظام کے مقابلے صحت منداور تازہ توانا نوجوانوں کی فطری اور صحت مند محبت کی ''شکست'' پیش کی گئی ہے۔ان دونوں کی کشمکش کو پیش کرتے ہوئے کرشن چندرا نے فرسودہ نظام کی فولادی اور مضبوط گرفت کو ظاہر کیا ہے۔''

(بیسویں صدی میں اردو ناول:از پروفیسر یوسف سرمست صفحہ(378)

کرشن چندر نے ناول (شکست) کے قصے کے پس منظر میں اس عہد کی تمام تر سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی صورتِ حال کو سمیٹنے کی سعی کی ہے جس میں نہ صرف کشمیر کی وادیوں کا منظر بلکہ پورے ہندوستان کا نقش آنکھوں میں پھر جاتا ہے جو نئی قدروں اور نئی دنیا کی تلاش میں سرگرداں ہے، ناول شکست کی اسی خصوصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے سیّد وقار عظیم لکھتے ہیں:

''شکست نئے دور کے انتشار میں ایک نئی اور دلکش دنیا کی تلاش وجستجو کا ترجمان ہے۔''

(ترقی پسند اردو ناول :از ڈاکٹر انور پاشا۔صفحہ:99)

ناول شکست کی ایک اور خوبی جس نے اس کی شہرت ومقبولیت میں چار چاند لگا دئے وہ کرشن چندر کا دلکش اسلوب اور فطری منظر کشی ہے۔اس اعتبار سے اردو کا کوئی ناول نگار ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

اشتراکی افکار ونظریات کو پیش کرتا ان کا ایک دوسرا ناول 'جب کھیت جاگے ہے' جو ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ناول جب کھیت جاگے میں کرشن چندر نے صوبہ تلنگانہ اور وہاں کے مظلوم کسانوں کے واقعات و حالات سے ناول کا پلاٹ تیار کیا ہے جس میں ان کی بھوک، بیماری، جہالت اور نا انصافی کو بطور موضوع پیش کیا گیا ہے ساتھ ہی کسانوں کو بیدار کرنے کی بھرپور کوشش بھی کی۔ناول میں راگھوراؤ کی درد بھری زندگی کو ہی بنیاد بنا کر کرشن چندر نے پورے ناول کے قصے کو مختلف واقعات و حادثات کی کڑی میں پرویا ہے۔راگھوراؤ ناول کا مرکزی کردار ہے، راگھو ایک احتجاجی اور جذباتی نوجوان ہونے کے ساتھ ہی تلنگانہ کے کسانوں کی اس تحریک کا اہم حصہ بھی ہے جو زمیندارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کی غرض سے وجود میں آئی ہے۔چونکہ راگھوراؤ کا بچپن تمام تر محرومیوں اور ذلتوں سے ہم کنار رہا۔بچپن کے وہ دن جب کسی بچے کی آنکھوں میں ماسومیت کے خواب پلتے ہیں، ظالم سماج کے سامنے ہر لحہ اسے رسوائی اور بے عزتی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، راگھو کی زندگی کا ایسا ہی ایک واقعہ اس کے بچپن میں اس وقت پیش آیا جب ریشم کے کپڑے کو چھو لینے بھر سے دکان دار نے اسے بری طرح جھڑک کر بے عزت کر دیا تھا وہیں ایک دوسرے موقعے پر علاقائی زمیں دار کے کارندوں نے اس کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا تھا۔خود راگھو کا باپ اسے اکثر خود کی زندگی میں ہوئے زمیں داروں اور سرمیہ داروں کی ظلم و زیادتیوں کے واقعات سنایا کرتا تھا جس نے رفتہ رفتہ راگھو کے ذہن و دل میں ایک انقلاب سا برپا کر دیا تھا۔چنانچہ راگھو اپنے آباواجداد سے ملے اس ورثے کو ایک بیش قیمت تحفہ مان کر اس کی حفاظت کرتا رہا۔اسی درمیان راگھو دبے کچلے کسان سے ایک انقلابی نوجوان بن جاتا ہے۔چنانچہ زندگی کی تمام تر محرومیوں اور اذیتوں کے سبب اس کے مر چکے احساس پھر سے جی اٹھے تھے۔بچپن سے زمیں داروں اور سرمایہ داروں کے ظلم و زیادتیاں سہنے والا راگھو آج مزدوروں اور مظلوموں کی آواز بن کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔راگھو کی اسی ہمت اور جواں مردی کی بدولت تلنگانہ میں کسانوں کی بادشاہت قائم ہوجاتی ہے۔حالانکہ راگھو کو بھی اس کی بڑی قیمت چکانی پڑتی ہے۔کسانوں کی تحریک میں پیش پیش رہنے کے سبب اسے جیل ہو جاتی ہے۔حکومت کی جانب سے اس پر معافی کا دباؤ ڈالا جاتا ہے لیکن چونکہ اب راگھو کی زندگی کا مقصد بدل چکا ہے وہ اب ظلم کے خلاف لڑ مرنے میں ہی ایک کسان کا اہم فریضہ خیال کرتا ہے۔چنانچہ معافی سے انکار پر اسے پھانسی کی سزا سنا دی جاتی ہے پھانسی سے قبل

راگھو کا باپ دوسرے علاقائی کسانوں کے ساتھ مل کر راگھو کے بچپن کی خواہش ریشمی قمیض اسے پہنا دیتے ہیں۔ راگھو بچپن کی اس خواہش کے پورا ہونے پر فخر محسوس کرتا ہے اور کسانوں کی ہمت اور حوصلوں کو دیکھ کر اب اسے یہ احساس ہو چلا ہے کہ کسانوں پر برسوں سے ہوتے رہے ظلم و بربریت کے خلاف اس کی لڑائی میں وہ اب اکیلا نہیں بلکہ اب ہر کسان میں راگھو کا انقلاب گھر کر چکا ہے۔ جو ظلم کے خلاف کمر بستہ ہونے میں انہیں ہمت اور حوصلہ عطا کریگا۔ راگھو کسانوں کے اس جوش وجذبے کو دیکھ کر اس نئی صبح کی آہٹ محسوس کر رہا ہے جب ملک میں ایک انصاف پسند سیکولر اور جمہوری حکومت ہوگی جو غریبوں، کسانوں، مزدوروں اور مظلوموں کے حقوق کی محافظ ہوگی غرضیکہ سماج کے ہی فرد کی عزت و وقار کے ساتھ جینے کا حق ہوگا۔ اس طرح کرشن چندر ناول کے پورے قصے کے پس منظر میں ایک ایسے سماجی نظام کے خواہش مند نظر آتے ہیں جس کی بنیادیں اشتراکیت اور مارکسزم سے جا ملتی ہیں۔ راگھو کا غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کے لئے لڑتے ہوئے پھانسی پر چڑھا دئے جانے تک کے واقعے سے عوام کے دلوں میں اشتراکی نظام حکومت کا جو تصور ابھرتا ہے وہ اس ناول کی تخلیق میں کرشن چندر کے بنیادی مقاصد کی تکمیل کرتا ہے۔ بلا شبہ یہ ناول کرشن چندر کی بہترین تخلیق اور راگھو ان کے پیش کردہ تمام کرداروں میں لافانی کردار کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ایسے ہی کردار قاری کو پوری طرح متاثر کرتے ہیں۔

اشتراکی نظام فکر کی جانب عوام کے ذہنوں کو متوجہ کرنے والا ان کا ایک اور ناول 'طوفان کی کلیاں' ہے جو ۱۹۵۴ء میں تخلیق ہوا۔ اس ناول میں کرشن چندر نے کشمیر کے ڈوگرہ شاہی مظالم کی داستان سنائی ہے۔ کیونکہ کشمیر جو اپنی خوب صورت وادیوں، سرسبد پودوں اور برف سے گھرے پہاڑوں کے سبب جنت تصور کیا جاتا ہے، تو وہیں غربت، جہالت اور استحصال کے سبب جہنم۔ کشمیر کا طاقت ور اور رئیس طبقہ ملک کے دیگر حصوں کے زمیں داروں اور سرمایہ داروں کی طرح غریبوں اور کمزوروں پر حاوی ہے۔

وہ حسن جگمگا اٹھی رہِ عشق و وفا نیرؔ
ابھی تک ہم وہی نقش قدم کو یاد کرتے ہیں

مدیر ماہنامہ 'شمع ادب' معروف شاعر، معتبر و مستند صحافی، سید توکل حسین نیر سلطانپوری، جن کی شاعری تصوف، احتجاج وانقلاب کی ایک موثر ترین آواز ہے، اور ان کی ادبی صحافت اپنی ایک الگ انفرادیت رکھتی ہے۔ ماہنامہ 'نیادور' بہت جلد نیرؔ سلطانپوری کی مجموعی ادبی خدمات پر ایک خصوصی شمارے کی اشاعت کرنے جا رہا ہے۔ قلمی تعاون درکار ہے۔

غریب ماؤں بہنوں کی عصمت دری کی جا رہی ہے اور محنت کش کسانوں اور مزدوروں کو ان کے خون پسینے کی محنت کے صلے میں بھوک، افلاس، مایوسی اور محرومی مل رہی ہے۔ چنانچہ کسان ڈوگرہ حکومت کے اس ظلم و بربریت کے خلاف بغاوت کر دیتے ہیں۔ نتیجتاً انہیں پولس کی بوٹوں سے لہولہان ہونا پڑتا ہے۔ باوجود اس کے کسان لگان دینے کو راضی نہیں۔ یوں کہیں تو کرشن چندر کے دیگر ناولوں کی طرح اس ناول میں بھی ان کا اشتراکی نظریۂ حیات پوری طرح واضح نظر آتا ہے۔ ان کی شدید خواہش ہے کہ سماج کا کوئی بھی طبقہ بھوکا نہ رہے۔ اور ظلم اور ناانصافی کے خاتمے کے ساتھ ہی سب کو برابری کا حق ملے۔ یہی اس ناول کے قصے کے پسِ پشت کرشن چندر کا اہم مقصد ہے۔

کرشن چندر نے ناول کو زندگی کے واقعات و حقائق کا ترجمان بنانے کی سعی کی۔ ان کے یہاں انسانی زندگی کی وسعتیں اپنی تمام تر رنگا رنگ جلووں کے ساتھ بکھری اور نکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ کرشن چندر کے ناول ان کے عہد کی جیتی جاگتی تصویر کہے جا سکتے ہیں۔ جن میں اس عہد کی سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی زندگی کی بھرپور عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کا قاری ان کے طنز کے نشتر سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد ملک جن سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی بحران سے گزرا کرشن چندر کے ناول اس کی تفسیر کہے جا سکتے ہیں۔ حصولِ آزادی کے بعد ہندوستانی معاشرے کے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلی کے جو امکانات اور تغیرات روشن ہوئے ان کے واضح اثرات کرشن چندر کے ناولوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کرشن چندر کے ناول اپنے اندر زندگی کی تمام تر سچائیوں، تلخیوں، نرمی اور شیرینی کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ کرشن چندر کی باریک بیں نگاہوں اور فنکارانہ شعور نے انسانی زندگی کی تمام پیچیدگیوں اور الجھنوں کے ساتھ سمجھنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے اور ان کی یہی کوشش انہیں ترقی پسند ناول نگاروں کی فہرست میں منفرد مقام عطا کرتی ہے۔

❑❑❑

نیر سلطانپوری: تہذیبی قدروں کا امین

خان محمد رضوان

D-307, M.M.I.P.

ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر

نئی دہلی

رابطہ: 9810862283

اردو شاعری کا ہندوستانی تہذیب سے گہرا رشتہ رہا ہے۔ اگر شاعری کا رشتہ تہذیب سے اور تہذیب کا رشتہ شاعری سے منقطع کر دیا جائے تو دونوں بے معنی ہو کر رہ جائیں گے۔ جس طرح تہذیب کسی بھی قوم کی شناخت ہوتی ہے اسی طرح زبان بھی ایک خاص قوم کی پہچان ہوتی ہے۔ مگر ان دونوں کے ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری رہتا ہے۔ ہر عہد میں تہذیب اور زبانوں کے زوال اور ترقی کا معاشرتی عمل دخل رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کس عہد میں اردو زبان و ادب کو زیادہ فروغ حاصل ہوا اور کس عہد میں کم ہوا۔ بالخصوص بیسویں صدی اردو شعر و ادب کے ساتھ تہذیب کی پامالی کا عہد رہا ہے۔ جہاں اس عہد میں شعری مذاق اپنے ماقبل سے زوال آمادگی کا شکار ہوا ہے وہیں قدیم تہذیب و تمدن کی جڑیں بھی کمزور ہوئیں ہیں۔

دراصل زبان اور تہذیب و تمدن کے زوال کا یہ عمل غیر فطری نہیں ہے کیوں کہ ہر عہد میں جہاں ہر دس اور بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر زبان بدل جاتی ہے وہیں کچھ فاصلے پر تہذیب و تمدن بھی ایک دوسرے سے جدا نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ تبدیلی ایک یا دو صدی سے جاری نہیں ہے بلکہ جب سے دنیا قائم ہے اور جب تک دنیا باقی رہے گی تغیر و تبدل کا سلسلہ بدستور جاری رہے گا۔ تبدیلی کا یہ عمل برسہا برس سے یونہی چل رہا ہے اور آج ہمیں ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ یہ اچانک ہو گیا۔ جب کہ اندازہ یہ ہے کہ ہر عہد میں تبدیلی اور ٹوٹ پھوٹ کے اس عمل سے لوگوں کا یہی ردعمل رہا ہوگا۔ جب کہ ایسا بالکل نہیں ہے کہ تبدیلی کا یہ معاملہ صرف زبان اور تہذیب کے ساتھ ہی ہے، بلکہ یہ تبدیلی دنیا کی ہر شے پر اثر انداز ہو رہی ہے۔

یہی سبب ہے کہ کسی زمانے میں لوگ سو سال اور ڈیڑھ سو سال کی عمر پاتے تھے۔ موسم اور آب و ہوا جدا تھے حتی کہ زمین و آسمان کی گردش اور رفتار میں بھی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔

سائنسی ایجادات و اختراعات کے سبب کچھ چیزیں جہاں آسان ہو گئی ہیں وہیں کچھ مشکلات بھی پیدا ہوئی ہیں۔ بہر حال تبدیلی کے اس فطری عمل سے کوئی چیز ماوریٰ نہیں ہے۔ سائنس جتنی تیزی سے ترقی پذیری کے عمل سے گزر رہی ہے تبدیلی بھی اتنی ہی سرعت سے واقع ہو رہی ہے جس کی وجہ سے انسانی فکر متاثر بھی ہو رہی ہے۔ کل کا انسان جس طور پر سوچتا تھا آج کا انسان اس بات کو کسی اور اعتبار سے سوچتا ہے۔

کل کی ذہانت اور آج کی ذہانت میں یکسر فرق نظر آتا ہے۔ بالخصوص بیسویں صدی کو سائنسی صدی اور ایجادات واختراعات کی صدی قرار دیا جاتا ہے اور اسی ترقی پذیر صدی میں چار اکتوبر ۱۹۰۸ء میں ضلع سلطانپور کے موضع ایسولی میں نیر سلطانپوری پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام سید توکل حسین تھا نیر سلطانپوری تخلص کیا کرتے تھے۔ ۱۵/اگست ۱۹۸۵ء کو ۷۷ سال کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

آپ فارسی، انگریزی اور اردو زبان وادب پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ آپ بیک وقت ادیب و شاعر بھی تھے اور صحافی بھی، آپ نے لکھنؤ سے نکلنے والا ادبی رسالہ ''فردوس'' کی کئی برسوں تک ادارت کا کام انجام دیا اور ایک سال تک ماہنامہ ''شمع ادب'' کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ آپ بنیادی طور پر صوفی منش انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نیر سلطان پوری نے شعروادب کے ذریعہ صرف گل وبلبل اور عشق وعاشقی کی باتیں نہیں کیں بلکہ اس کے توسط سے بندگان خدا کی راہ یابی کا کام بھی کیا۔ بندگان خدا کو اپنی شاعری کے ذریعہ خودشناس اور خداشناسی کی ترغیب بھی دی اور پوری عمر بندوں کی خدمت میں لگے رہے۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اپنا خاندانی مکان اپنی حیات ہی میں ابتدائی صحت کے مرکز کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ظاہر ہے یہ کام وہی کرسکتا ہے جس نے خدا کی عظمت کے ساتھ عظمت انسانی کو بھی پہچانا ہو۔ اگر ہم صوفی شعرا کی زندگی کا غائر مطالعہ کریں اور ان کی شاعری کو بغور پڑھیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ انھوں نے کس طرح خدا کے ساتھ بندوں سے بھی محبت کی اور اپنی پوری زندگی انسانوں کی خدمت کے لیے وقف کردی۔ نیز اپنی ادبی تخلیقات کے ذریعہ بندوں کی راہ یابی کا سامان کیا۔ نیر سلطانپوری نے بھی بحیثیت صوفی شاعر کے اپنی زندگی کو خدا کے ساتھ بندوں سے بھی وابستہ رکھا اور اپنی شاعری کو اپنی روایت سے مربوط رکھتے ہوئے فنی تقاضوں کو پورا کیا جس کی وجہ سے جابجا انسانوں کو انسانیت پر ابھارا گیا ہے اور اپنے مذہبی تشخص کے ساتھ اپنے تہذیبی تشخص کو برقرار رکھنے پر زور دیا ہے۔ اگر ہم ان کی شاعری کا غائر مطالعہ کریں تو شعروں کے حوالے سے ان کی کئی تصویر ہمارے سامنے ابھر کر آتی ہے۔ کہیں وہ صوفی شاعر کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں، تو کہیں مصلح قوم بن جاتے ہیں، تو کہیں ناصح خوش گفتار کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اور کہیں محض ایک سادہ لوح شاعر نظر آتے ہیں۔ یہ ان کی شاعری کے خاص عکس ہیں جن میں وہ ایک مکمل صوفی اور تہذیبی قدروں کے امین نظر آتے ہیں۔

نمونے کے چند ایسے اشعار ملاحظہ کیجئے جن سے نیر سلطانپوری کی نہ صرف تصویر ابھر کر سامنے آئے گی بلکہ ان کی نیرنگیِ فکر اور روئیدگیِ خیال کا بخوبی اندازہ بھی لگایا جاسکے گا۔

خارِ صحرا نے تو چاہا تھا کہ آگئے نہ پڑھوں
آبلے ٹوٹ گئے دل نہ ہمارا ٹوٹا

☆

شعورِ ربط باہم بھی ستاروں سے اگر لے لے
بدل سکتا ہے تقدیر جہاں ہر آدمی تنہا

☆

ارتقائے معرفت پر ختم سب افسانہ تھا
شمع کے سائے میں نیرؔ کشتہ پروانہ تھا

☆

ہر نفس ہے غبارِ راہِ حیات
زندگی ہے سبک خرام بہت

☆

بڑی مشکل ہے یہ آہِ رسا کس پر یقیں کرلے
اثر کچھ اور کہتا ہے دعا کچھ اور کہتی ہے

☆

کہنے بھی نہ پائے غم ہستی کا فسانہ
رستے ہی میں نیند آگئی راہوں کی تھکن سے

ہے قطرہ شبنم بھی کسی دردؔ کا حاصل
لیکن وہ مرے عشق کا پیغام نہیں ہے

☆

چاک دامانی ہی نیرؔ عشق کی معراج ہے
آپ چاہیں اس کو میرا حوصلہ کہہ لیجئے

☆

کیا گزرتی ہے مرے دل پہ کوئی کیا جانے
میری رودادِ الم سب سے نہ پوچھا کیجئے

محولہ بالا اشعار کی اگر ہم فکری، فنی اور لسانی سطحوں پر تفہیم کرنا چاہیں تو اندازہ ہوگا کہ وہ ہر سطح پر ایک خاص معیار کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی فکر کی ترسیل میں کامیاب ہیں۔ ان اشعار سے ہم ان کی فکری پرواز، موضوعات کی ترجیحات اور لفظ وبیان کے ساتھ لہجے اور برتاؤ کی عمدگی اور پختگی کا بھی بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ان کی شاعری کے مخاطب انسان ہیں، وہ انسانوں کے ہمدرد، خیرخواہ اور راہنما کی حیثیت سے ان کے مسائل کے مداوا کے خواہاں ہیں۔ وہ دنیا اور مافیہا کی بے ربطی، درپیش مسائل اور مختلف النوع چیلنجز کو قریب سے دیکھ کر سرسری طور پر گزر نہیں جاتے بلکہ چند لمحے ٹھہر کر، رک کر اس کا حل تلاش کرتے ہیں وہ شعر کی زبان میں پیغامبری کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی مسائل ومعاملات کے ایک ایک پہلو پر برسوں غور وفکر کرتے ہیں اور ایک نباض کی طرح بے حد باریک بینی سے اس پر نظر رکھتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ ان سب کے باوجود انھوں نے اپنا رشتہ اپنی روایت سے اسی قدر مربوط رکھا ہے جیسے کہ پہلے تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی شاعری کلاسیکی رنگ وآہنگ سے مملو نظر آتی ہے۔ جابجا کلاسیکی طرز وانداز، پیرایہ بیان، فکری وفنی میلان اور زبان وبیان کا دروبست کلاسیکی رچاؤ سے مالا مال ہے جس کے نتیجے میں ان کے کلام زبان کی چاشنی وشیرینی اور لطافت بیان کا خوبصورت نمونہ معلوم ہوتے ہیں۔ نیر سلطانپوری کے

شعری کمالات کے تعلق سے ڈاکٹر سید محمد عقیل لکھتے ہیں:

''نیرؔ سلطانپوری دراصل فطری شاعر ہیں۔ وہ جذبات کی بازآفرینی ہی کو اصل شاعری سمجھتے ہیں جو ان کے تجربات عشق کے بیچ و بن میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ عشقیہ شاعری میں منطقی تعمیر اور تعبیر کی تلاش احساسات کی ان روؤں کو اسیر کرسکتی ہے جس سے شاعر گزرتا ہے۔ اس لیے شاعر کے محسوسات ہی کو عشقیہ شاعری میں اہمیت ہوتی ہے۔ نیرؔ صاحب کے محسوسات قاری کے ساتھ متحرک رہتے ہیں اور ان کی شاعری کا کلاسیکی انداز قاری کو اپنی گرفت میں لیے رہتا ہے۔ وہ ایک پختہ کار شاعر ہیں اس لیے ان کی شاعری ان تمام فنی اسقام سے دور ہے، جن پر گرفت مضبوط نہ ہونے کی وجہ سے آج کا شاعر اکثر اپنا شعری اعتبار کھو دیتا ہے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ نیر سلطانپوری فطرت زبان بولتے ہیں اور وہ جذبہ اور احساس کے شاعر ہیں۔ ان کے نزدیک عقل وہوش سے زیادہ جذبہ وجنون کی اہمیت ہے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ جو جذبہ واحساس کا شاعر ہوگا وہ حساس طبیعت بھی ہوگا اور جس کی حسّی کیفیات متحرک ہوں گی وہ ہوش وخرد اور مصلحت اندیشی سے کوسوں دور ہوگا۔ اس لیے کہ مصلحت پسندی اور عقلی حربے فطرت سے دور اور دنیا سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ عقل وہوش نفع اور نقصان سے انسان کو آگاہ کرتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں انسان نقصان کے خوف سے اپنے جذبہ وجنون کا خون کر دیتا ہے یعنی اسے دبا دیتا ہے جو فطرت کے عین منافی عمل ہے۔ اسی لیے اقبال نے عقل وخرد پر جذبہ وجنون کو فوقیت اور افضلیت دی ہے۔ جذبہ کے اسی رویے کے برتاؤ کے نتیجے میں نیر کی شاعری میں جذبات کی بازآفرینی اور سحر انگیزی کی صورت میں نظر آتی ہے۔

دراصل نیر سلطان پوری نے اساتذہ فن سے فنی اور فکری اکتساب کیا ہے۔ جسے ہم ان کے فکری اور فنی حوالوں میں نمایاں طور پر محسوس کر سکتے ہیں۔ اسی کے نتیجے میں انھوں نے تادم آخر اپنی قدیم روایات اور قدیم تہذیب وثقافت سے کبھی روگردانی نہیں کی بلکہ اسے ہی اپنے شعری رویے کا مطمح نظر بنالیا۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس حوالے سے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''نیرؔ صاحب اردو شعرا کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو ایک رچی ہوئی تہذیب، ایک بالیدہ ثقافت اور اقدار وروایات کے ایک مستحکم نظام کے آغوش میں پروان چڑھی تھی۔ ان کے یہاں ایک کلاسیکی مزاج موجود ہے۔

وہ اپنے تغزل کو زمانے کے لیے تفریح طبع کا سامان نہیں بنانا چاہتے۔ وہ فکر انگیز شاعری کے قائل ہیں۔ اعلیٰ ادب کی تخلیق کے لیے اعلیٰ درجہ کی متانت اور خلوص درکار ہوتا ہے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ نیر سلطانپوری فطرت زبان بولتے ہیں اور وہ جذبہ اور احساس کے شاعر ہیں۔ ان کے نزدیک عقل وہوش سے زیادہ جذبہ وجنون کی اہمیت ہے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ جو جذبہ واحساس کا شاعر ہوگا وہ حساس طبیعت بھی ہوگا اور جس کی حسّی کیفیات متحرک ہوں گی وہ ہوش وخرد اور مصلحت اندیشی سے کوسوں دور ہوگا۔ اس لیے کہ مصلحت پسندی اور عقلی حربے فطرت سے دور اور دنیا سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ عقل وہوش نفع اور نقصان سے انسان کو آگاہ کرتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں انسان نقصان کے خوف سے اپنے جذبہ وجنون کا خون کر دیتا ہے یعنی اسے دبا دیتا ہے جو فطرت کے عین منافی عمل ہے۔ اسی لیے اقبال نے عقل وخرد پر جذبہ وجنون کو فوقیت اور افضلیت دی ہے۔

بالا اقتباس اور اشعار کی روشنی میں نیر سلطانپوری کی شاعری کا محاسبہ کیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ ان کے یہاں شاعرانہ بانک پن کے ساتھ وارفتگی عشق کا خوبصورت اظہار بھی ہے۔ ساتھ ہی ماضی کی داستانِ غم اور حال کا کرب بھی پوشیدہ ہے۔ وہ ایک حوصلہ مند شاعر ہیں، نابرابری حالات، ناموافق اور نامساعد حالات کے باوجود کبھی حوصلہ نہیں کھوتے، ہمیشہ حوصلہ مندی سے کام لیتے ہیں جس کے نتیجے میں درد وغم اور اضطراب کی کیفیت کو سرمستی اور سرشاری میں بدل دیتے ہیں۔ ان کی شاعری کو پڑھ کر ہمیں کہیں بھی لایعنیت اور بے مقصدیت کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے اپنے شعری سفر میں اساتذہ فن سے روشنی حاصل کی ہے جس کی وجہ سے فکری اور فنی رچاؤ کے ساتھ اظہار وبیان کی سطح پر بھی یہ احساس ابھرتا ہے۔ یہاں ہم علامہ اقبال اور جگر کا ایک شعر نقل کرتے ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ نیر سلطانپوری نے کس حد تک استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کے جواب شکوہ کا پہلا شعر ہے۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

جگر مرادآبادی کا ایک شعر دیکھئے:

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

مذکورہ بالا دونوں اشعار کو بغور دیکھئے اور ذیل میں نیرؔ سلطانپوری کے اس شعر کو دیکھئے:

جو بات نکلتی ہے دل سے رکھتی ہے اثر بھی اے نیرؔ
پیغام محبت دو تو سہی یارانِ وطن سے کیا ڈرنا

جب آپ ان کا تطابق کریں گے تو احساس ہوگا کہ نیر نے اقبال کے دونوں مصرعوں کے مفہوم کو اپنے ایک مصرعہ میں سمو دیا ہے۔ اسی طرح جگر مرادآبادی کے دونوں مصرعوں کے مفہوم کو انھوں نے اپنے شعر کے ایک مصرعہ میں پرو دیا ہے۔ یہ ان کا شعری اور فنی کمال بھی ہے۔

ذیل میں ہم نیرؔ سلطانپوری کے چند مزید ایسے اشعار نقل کر رہے ہیں جن کو پڑھ کر پوری طرح ان کا

شعری امتیاز واضح ہوجائے گا ساتھ ہی ان کا شعری افق بھی روشن ہوگا۔اشعار ملاحظہ کریں:

رکھ لی جبینِ شوق نے خود آستاں کی لاج
ورنہ گزر گئے تھے حدِ بندگی سے ہم

☆

دیوان گانِ شوق نے ورثے میں دے دیا
تاعمر اہل ہوش گریباں سیا کریں

☆

کیجئے تعمیر پھر اک نیا صحرا کوئی
خاک کے ذرّوں نے بھی چاک کئے پیرہن

جہاں میں دار و رسن کا جو اہتمام نہ ہو
وفا کے رنگ میں پیدا کبھی دوام نہ ہو

☆

جی چاہتا ہے قصہ غم مختصر نہ ہو
ایسی بھی ایک رات ہو جس کی سحر نہ ہو

لازم ہے کہ پیدا ہوجائے کچھ قول وعمل میں ہم رنگی
پہلے تو گریباں چاک کرو پھر ہم سے جنوں کی بات کرو

☆

جنوں کے حوصلوں پر یہ خرد کی بندشیں کیسی
بڑے ناداں ہیں جو رنجیر کو بارِ گراں سمجھے

☆

صحبت ہمیں راس آہی گئی اہل جنوں کی
اب ہاتھ بھی دامن کا طلب گار ہے جیسے

☆

بندشوں میں گھر کے بھی تعمیر کر دینا نئی
اک زمانہ ہوگیا دیوار زنداں دیکھتے

☆

بچیں تو چلیں خوب خرد اور جنوں کی
آگے نہ بڑھی بات مگر دار و رسن کی

☆

کیوں اہل نظر کے شکوؤں سے دل تھام کے بیٹھے جاتے ہو
ہم کو تو خود اپنی گردن پر ہی خونِ تمنا رکھنا ہے

☆

محرومیٔ قسمت پر میری یہ آنکھ میں آنسو کیسے ہیں
اس دل شکنی کے پردے میں یہ شیشہ گری بھی خوب ہے

نقوش ایام

'نیادور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک 'نقوش ایام نمبر' بھی شامل ہے۔ادب وتاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیادور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔اسکی قیمت ۲۰۰/ روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۱۵۰/روپئے ملا کر کل قیمت ۳۵۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیادور'

☆

کردار ہے جس کا سرد نفس عنوان ہے جس کا خون دل
نیرؔ ترے سب افسانوں میں وہ ایک کہانی خوب رہی

☆

آتش عشق سے جل جانے میں کیا رکھا ہے
شمع بجھ جائے تو پروانے میں کیا رکھا ہے

☆

ہم چلے آئے سکون غم فردا لے کر
لوگ کہتے تھے میخانے میں کیا رکھا ہے

مندرجہ بالا اشعار نیرؔ سلطانپوری کے تخلیقی نمونے ہیں، جن میں ان کی صلابتِ فکر کا عکس جا بجا جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔اوران کے متنوع فکری کینوس کا ادراک بھی کیا جاسکتا ہے۔ وہ عزم وارادہ کے پختہ شاعر تھے۔انھوں نے ابتذال فکر کو کبھی بھی جگہ نہ دی اور نہ کبھی اپنے پایہ فن کو متزلزل ہونے دیا۔انہوں نے شاعری کو اپنی فکر، اپنے احساسات اور تجربات کے برتاؤ کا وسیلہ بنایا ۔ انھوں نے جو کچھ بھی سوچا، محسوس کیا اور تجربات ومشاہدات میں آنے والے معاملات ومسائل کو بے حد خوبصورتی اور فنی کاری کے ساتھ پیش کیا۔ان کے یہاں کہیں داستان کا دلکش بیان ملتا ہے، تو کہیں معاملات ومسائل کا تلخ اظہار ، تو کہیں احساسات کی نیرنگی کا محیر العقول بیان بھی ملتا ہے، اور کہیں مختلف النوع تجربات ومشاہدات کا المیہ پیش کیا گیا ہے۔اسی طرح جگہ جگہ جذبہ وجنون اور جذبہ شوق کا نیرنگ اظہار بھی پایا جاتا ہے۔ان سب کے ساتھ جوان کی شاعری کا سب سے ابھرا ہوا اور خاص پہلو ہے وہ ہے مستحکم ارادہ اور مصمم یقین جو ہمیشہ دلوں کو گرماتا بھی رہتا ہے اور فکر وخیال کو تازگی بھی بخشتا رہتا ہے۔ ان کے یہاں صفحہ در صفحہ حوصلہ مندی کا اظہار ملتا ہے اور امید کی شمعیں ضوفشاں رہتی ہیں۔جس کی وجہ سے مستقبل کی تابناکی اور روشن مستقبل کا یقین پختہ ہوتا رہتا ہے۔ان کا ماننا ہے کہ مایوسی اور بزدلی ایمان کے منافی افکار ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی زندگی اور شاعری میں کبھی بھی مایوس نہیں نظر آتے ۔ہمیشہ امید کا دامن ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور یہی خصوصیت ان کی شاعری میں امتیازی شان کی حیثیت رکھتی ہے۔

❑❑❑

اردو تاریخ کا ایک ورق

کائستھ فرقے کی ادبی خدمات

(ایک خانوادہ، پانچ پشتیں اور ایک سو پچاس برس)

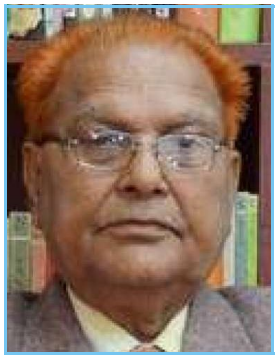

پی پی شریواستو رندؔ

R-16

سیکٹر ۱۱، نوئیڈا

رابطہ: 97114220158

ادب عظمتوں کا امین ہوتا ہے اور ادیب اس کا پاسدار، نگہبان۔ سچّا ادیب فن کی تمام عظمتوں کو اتنی خوبصورتی سے آئینہ دکھلاتا ہے کہ اس کے پرتو سے احساسات اور جذبات جگمگا اٹھتے ہیں۔ لکھنؤ کے نوبستہ خاندان کی شعری روایت کے وارثوں میں کائستھ فرقے کی پانچ پشتوں نے اپنے خونِ جگر سے اُردو ادب کی نہ صرف آبیاری کی بلکہ ادب کی عظمتوں میں اضافہ بھی کیا۔ زبان کا تعلق کسی خاص فرقے، قوم یا مسلک سے نہیں ہوتا مگر کائستھ فرقہ نے فارسی کے دَور سے لے کر مغلیہ دَور تک متحدہ طور پر فارسی اور اُردو زبانوں کی نشو ونما کی اور ترقی کی راہیں ہموار کیں اور خود کو ادبی خدمات کے لئے وقف بھی کیا۔ آج میں دبستانِ لکھنؤ کے اسی نوبستہ خاندان کی ادبی خدمات کا تذکرہ کروں گا جس کی پانچ پشتوں نے تقریباً ایک سو پچاس برس تک خود کو ادب کے لئے وقف کیا جو اردو اور فارسی ادب کی تاریخ میں ایک مثال ہے اور جس کا سہرا کائستھ فرقہ کو جاتا ہے۔

منشی دوارکا پرشاد افقؔ لکھنوی کے خاندان میں کئی پیڑھیوں سے فارسی اور اُردو شاعری اور نثری سلسلہ چلا آرہا تھا۔ ان کے اپنے گھرانے کا ماحول تو خالص ادبی تھا ہی مگر ادب کی محبت اور ادب سے لگاؤ ان کو اپنے ننہال کی طرف سے بھی ملا۔

افقؔ کی ولادت لکھنؤ کے محلہ نوبستہ کے ایک مشہور ادبی خاندان میں ہوئی۔ ان کے آباء و اجداد دلّی کے باشندے تھے اور مغل بادشاہ محمد شاہ کے زمانے میں اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ نادر شاہ کے حملے میں ان کے خاندان کے کئی افراد موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے اور بچے کھچے دو افراد منشی جگن ناتھ اور منشی شری ناتھ نے دلّی سے ہجرت کی اور لکھنؤ کا رخ کیا، محلہ نوبستہ میں سکونت اختیار کی۔ دوارکا پرشاد افقؔ کے پَردادا، دادا اور والد اور ان کے بیٹے کے علاوہ ان کے دو بھائی بھی اُردو اور فارسی کے عالم، فاضل، شاعر اور نثر نگار تھے، جن کا شمار اس وقت کے بڑے ادیبوں میں شامل تھا، جس کی پانچ پشتوں نے اُردو اور فارسی کی خدمت کی۔

پہلی پشت (پردادا)	منشی ادے راج مطلعؔ
دوسری پشت (دادا)	منشی ایشوری پرشاد شعاعیؔ
تیسری پشت (والد)	منشی پورن چند ذرّہؔ

چوتھی پشت

منشی پورن چند زرّہ کے تین بیٹوں میں سے زیادہ صلاحیت منشی دوارکا پرشاد افقؔ میں تھی۔ افقؔ صاحب کے بڑے بھائی منشی رام سہائے تمنّا (1804-1932) بھی اپنے زمانے کے مشہور شاعر تھے۔ افقؔ صاحب کے منجھلے بھائی منشی ماتا پرشاد نیسانؔ کی بھی اُردو نظم اور نثر میں کئی کتابیں تھیں۔ محلہ نوبستہ لکھنؤ ہی میں بھی یہ خاندان پھولا اور پھلا۔

پانچویں پشت

منشی اُدے راج مطلعؔ کی پانچویں پشت میں منشی دوارکا پرشاد افقؔ کے ہونہار فرزند تھے منشی بشیشور پرشاد منورؔ لکھنوی (وفات 1970) جن کا شمار بیسویں صدی کے استاد الشعراء اور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ پانچوں پشتوں کا یہ کائستھ خاندان جو تقریباً 150 برس کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اس نے اُردو اور فارسی کی بے حد خدمت کی اور اپنے پیچھے ایک بڑا ادبی سرمایہ چھوڑا۔ یہ کائستھ خاندان ملک کی تہذیبی، سماجی اور تعلیمی وراثت کا علمبردار ہے۔ آج کے ادبی حلقے سے اس خاندان کا تعارف کرانا اس لئے بھی ضروری ہے کہ آج کی نسل ان سے واقف نہیں۔

۱۔ منشی اُدے راج مطلعؔ:

منشی اُدے راج مطلعؔ کا دَور عظیم شاعر میر تقی میرؔ اور مرزا سوداؔ کے بعد کا ہے۔ ان کو عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر بھرپور عبور حاصل تھا۔ ان کے کلام میں فصاحت بھی ہے اور بلاغت بھی۔ ان کا اندازِ نگارش بھی دل پذیر ہے:

در ابر آتشِ رخسار عیاں می بینم
برق بیتاب دریں اَبر نہاں می بینم

(اس تابناک چیز کی آگ میں دھواں دیکھتا ہوں یعنی اس چھپے ہوئے بال کے اندر ایک تڑپتی ہوئی بجلی کو دیکھتا ہوں۔)

۲۔ منشی ایشوری پرشاد شعاعیؔ:

افقؔ کے دادا منشی ایشوری پرشاد شعاعی منشی اُدے راج مطلعؔ کے تیسرے بیٹے تھے۔ شعاعیؔ فارسی اور اُردو کے مقبول شاعر اور ایک بڑے نثر نگار تھے۔ ان کی فارسی کی شاعری اعلیٰ شعریت کے زیور سے آراستہ تھی:

نہ عاقل گفتہ باید بر کے زَا
بود عاقل کہ جویائے تو باشد

(ہر شخص کو عقلمند نہیں کہنا چاہئے۔ عقلمند وہی ہے جو تیری تلاش کرتا ہے۔)

بھر کوچہ بود شور زعشعت
بھر بازار سودائے تو باشد

(تیرے عشق کی ہر گلی میں شور ہے، ہر بازار میں تیرے ہی چاہنے والے ہیں۔)

۳۔ منشی پورن چند زرّہ:

افقؔ کے والد منشی پورن چند زرّہؔ زمانۂ شاہی میں رائے صاحب چکلا دار بیسواڑہ کے علاقہ جات کے منتظم تھے۔ انگریزوں کے زمانے میں محلہ نہر آگرہ کے سرشتہ دار تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کے اچھے شاعر تھے۔ زرّہؔ نے 1887 میں نوبستہ لکھنؤ میں ایک پریس بھی قائم کیا تھا، جس سے ہفت روزہ "تمنائی" نکلتا تھا۔ زرّہؔ نے اس دارفانی کو 19 جولائی 1950 میں کوچ کیا۔ ان کے بیٹے رام سہائے تمنّاؔ نے ان کی وفات پر ایک نوحہ کہا، جس کا آخری شعر ہے:

اے تمنّا سال تاریخ وفاتش کن رقم
منشی پورن چند صاحب رفتِ ازیں دارِ فنا

۴۔ منشی رام سہائے تمنّاؔ

منشی رام سہائے تمنّاؔ کی ولادت محلہ نوبستہ لکھنؤ میں ہوئی اور سن پیدائش 1885 ہے۔ وہ منشی شنکر دیال فرحتؔ کے شاگرد تھے اور فارسی کے جانے مانے شاعر تھے۔ تمنّاؔ صاحب ایک عرصہ تک محکمۂ تعلیمات میں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول رہے۔ ان کو کئی ریاستوں جیسے دکن، نیپال، رامپور، الور، کٹک اور میسور وغیرہ نے اعزازات سے نوازا۔ تمنّاؔ کی معرفتِ حقیقی سے لبریز غزلیں اس زمانے میں بہت مشہور ہوئی تھیں۔

خداوندِ زماں تو ہے، کہوں کیا میں جہاں تو ہے
اِدھر تو ہے، اُدھر تو ہے، یہاں تو ہے، وہاں تو ہے
ہے بلبل تو، گلِ تر تو، چمن تو، بوستاں تو ہے
بہارِ باغ تو ہے، بوئے گُل تو، باغباں تو ہے
جگر تو ہے، سینہ تو ہے، قلب تو ہے، باغباں تو ہے
نظر تو ہے، بشر تو ہے، بیاں تو ہے، زباں تو ہے

تمنّاؔ نے فارسی میں بھی شاعری کی اور کمال کی شاعری کی۔ انہیں فارسی زبان پر پورا عبور حاصل تھا۔

بادی راہ شریعت یاز دنیا دار پاش
آنچہ باشی باش، لیکن عاشقِ دلدار باش

(چاہے تو شریعت کا راستہ دکھانے والا ہو، چاہے دنیادار ہو، تو جو چاہے ہو، لیکن خدا کا عاشق ضرور ہو۔)

۵۔ منشی ماتا پرشاد نیسانؔ:

منشی ماتا پرشاد نیسانؔ دوارکا پرشاد افقؔ کے منجھلے بھائی تھے، جن کی ولادت بھی محلہ نوبستہ لکھنؤ میں 1860 میں ہوئی۔ وہ پہلے نکہت تخلص رکھتے تھے۔ بعد میں نیسانؔ تخلص اختیار کیا۔ حضرت میرؔ اور داغؔ کے رنگ کے شعر کہتے تھے۔ انھوں نے غزل، مسدّس اور مثنوی وغیرہ اصناف پر طبع آزمائی کی۔ نیسانؔ نے رجب علی بیگ کے فسانۂ عجائب کو بھی نظم کیا اور اپنے زمانے میں بہت مقبولیت حاصل کی:

وہ بیٹھے مری بغل میں تو منھ چھپائے ہوئے
جھجکے، دبے ہوئے، سمٹے ہوئے لجائے ہوئے

.....

چشم بد دُور اب ہم ایسے راز ہیں
وہ ہمارے طالبِ دیدار ہیں

۶۔ منشی دوارکا پرشاد افقؔ:

منشی دوارکا پرشاد افقؔ کی ولادت بھی محلہ نوبستہ لکھنؤ میں جولائی 1864 میں ہوئی۔ وہ اُردو، فارسی اور ہندی کے ماہر تھے مگر ان کو انگریزی اور سنسکرت پر بھی عبور حاصل تھا۔ نظم اور نثر دونوں میں قلم کاری کے جوہر دکھائے۔ اس زمانے کے لوگ جب ان کی نثر پڑھتے تو عش عش کر اٹھتے۔ بیک وقت شاعر بھی تھے، نثر نگار بھی، صحافی بھی اور ڈرامہ نگار بھی۔ تنوع افقؔ کے مزاج کا خاصّہ تھا۔ انہوں نے غزل، مثنوی، قصیدہ، مخمّس، مسدّس، نظم، رباعی سارے اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی اور مضامین

بھی لکھے۔ ان کے تراجم کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ مہابھارت، رامائن اور بھگوت گیتا کئی مذاہب کی کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔ محض 49 برس کی عمر میں دوارکا پرشاد افقؔ کا انتقال ہوا۔ ان کے ادبی کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ افقؔ کی رباعیات کو خاصی فوقیت حاصل ہے، جو ہمارے کلاسیکی ادب کا ایک بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔ وہ گنگا جمنی تہذیب اور حُب الوطنی کے مزاج سے سرشار تھے۔

افقؔ کے اپنے گھرانے کا ماحول خالص ادبی تھا مگر ان کو یہ ورثہ ننہال کی طرف سے بھی ملا۔ عظیم ادیب اور ممتاز شاعر منشی شنکر دیال فرحتؔ (1830-1890) افقؔ کے سگے ماموں تھے اور ان کے استاد بھی۔ افقؔ کی شاعری میں ناسخؔ کا اثر ضرور نظر آتا ہے لیکن یہ اثر زبان کے استعمال میں احتیاط برتنے کا تقاضا زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ نظام حیدرآباد نے افقؔ کو ملک الشعراء کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔

کبھی شوخی، کبھی مستی، کبھی غصّہ، کبھی شرم
نہیں معلوم ان آنکھوں میں تری کیا کیا ہے

.....

ہمارا بھولا پن دیکھو، جب آئی آخری ہچکی
محبّت میں یہ ہم سمجھے، وہ ہم کو یاد کرتے ہیں

۷۔ شری متی مہتاب کنورؔ:

جناب درگا پرشاد افقؔ کی شادی 15 برس کی عمر میں 1879 میں ہوئی۔ کہتے ہیں کہ اپنی ملازمت کے سلسلہ میں درگا پرشاد افقؔ کسی سے ملاقات کرنے گئے۔ لیکن وہاں دوران گفتگو شعری صلاحیت اور ذہانت کی ایسی چھاپ چھوڑی کہ رائے صاحب سپرنٹنڈنٹ محکمۂ جنگلات ریاست کوٹہ بوندی نے اپنی بڑی بیٹی مہتاب کنور کیلئے ان سے شادی کا پیغام ان کے والد کو بھجوادیا۔ ان کی رفیقۂ حیات مہتاب کنورؔ تھی۔ ان کے گھرانے میں بھی اُردو اور فارسی شاعری کا رواج تھا۔ مہتاب کنور کے سگے بھائی جگدمبکا پرشاد قیصرؔ شاعر تھے۔ مہتاب کنورؔ کو بھی اردو شاعری کا شوق تھا۔ ان کی تعلیم کب اور کہاں ہوئی، اس بات کا سراغ نہیں ملتا مگر مہتاب بھی شعر کہتی تھیں۔ ان کی شاعری میں ہندی کے الفاظ نگینہ کی طرح نظر آتے ہیں۔ مہتاب کا انتقال 1943 میں ہوا۔

''سنگ'' میں رہتے ہیں اے مہتابؔ سب کے چار چود
جس نے ان سے ''مترتا'' کی بس وہی لُوٹا گیا

۸۔ منشی بشیشو پرشاد منورؔ لکھنوی:

منشی درگاہ پرشاد افقؔ کے صاحبزادے منشی بشیشور پرشاد منورؔ پر بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں کہ کائستھ گھرانے کی پانچویں پشت نے بھی میدانِ سخن میں جھنڈے گاڑے اور اونچے جھنڈے گاڑے۔ شعر و سخن کی فضا میں آنکھیں کھولیں اور اوائلِ عمر میں ہی شاعر بن گئے۔ منورؔ صاحب نے تیرہ چودھ سال کی عمر سے ہی شاعری کا آغاز کیا۔ منشی نوبت رائے نظرؔ کا تلمّذ اختیار کیا۔ منورؔ صاحب کے خسر منشی لچھمن پرشاد صدرؔ لکھنوی جنھوں نے غیر منقوط ''گیتا'' منظوم کی، اپنے زمانے کے مشہور شاعر تھے۔

منورؔ صاحب نے تعلیم انٹر تک حاصل کی لیکن انگریزی، اردو، فارسی اور سنسکرت جیسی زبانوں پر ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ 1957 میں ریلوے کے محکمۂ آڈٹ سے سبکدوش ہوئے اور ادب کی خدمت میں لگ گئے۔ وہ ایک اچھے شاعر ہی نہیں اعلیٰ درجے کے مترجم بھی تھے۔ ''نذرِ ادب'' رباعیات 1929، ''کائنات دل'' نظمیں (1929)، نوائے کفر اور ادائے کفر'' (1962)، رابیندر ناتھ ٹیگور کی ''گیتانجلی'' کا ترجمہ، اس کے علاوہ بھی ان کی ایک درجن سے زیادہ تخلیقات شائع ہوئیں۔ ان کے شاگردوں کی تعداد سیکڑوں پر مشتمل ہے۔

میں نے مختصر طور پر ایک خانوادہ جس کا تعلق کائستھ گھرانے سے رہا اور جن کی پانچ پشتوں نے متواتر اُردو ادب کی خدمات ہیں، یہ تذکرہ اس لئے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اردو ادب میں پشتینی طور پر کوئی دوسری مثال نظر نہیں آتی۔ کائستھ فرقے کے بارے میں علیم صبا نویدی کی رائے کچھ اس طرح ہے:

''شمالی ہندوستان کے ہندوؤں میں کائستھ قبیلے کے لوگوں نے بھی سب سے پہلے فارسی زبان سیکھی اور مسلمان بادشاہوں کے یہاں دیوان کے منصوبوں اور مالیاتی شعبوں کے گماشتوں کے عہدوں پر فائز ہوئے۔ یہ لوگ ذات، پات، نسل اور فرقے کے امتیازات سے بے نیاز تھے۔ مزید یہ کہ اس قبیلے کے لوگ مسلمان صوفیائے کرام، علماء، فضلاء اور شعراء کے ساتھ آزادانہ طور پر اٹھتے بیٹھتے تھے اور فارسی فنون اور ادب میں اپنی فطری دلچسپی اور شوق کا مظاہرہ کرتے تھے۔ فارسی زبان تقریباً ان کی مادری زبان بن گئی تھی۔ اس قبیلے کے کئی علماء، فضلاء مثلاً منشی لکشمی نرائن شفیقؔ، ٹیک چند وغیرہ نے فارسی ادب کی بہت سی صنفوں میں اپنی بے شمار اور لازوال تخلیقات پیش کیں۔

بعد کے مغلوں کے دَور میں جب اُردو نے بہت مقبولیت حاصل کی تو ''کائستھ'' بھی اس زبان کے سیکھنے اور اپنے قبیلے کی عورتوں میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں بڑی دلچسپی دکھائی۔''

کائستھ فرقے کی اُردو اور فارسی کی ادبی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے جنھوں نے اپنے خونِ جگر سے ادب کی آبیاری کی۔ افسوس کہ یہ ذہین فرقہ اردو دنیا سے دُور ہوگیا اور اس طرف کسی کی نظر بھی نہیں گئی۔ وجوہات بہت سی ہیں مگر آج کی نسل اس طرف متوجہ نہیں ہونا چاہتی۔ غیر مسلم شعراء جو آج کل مشاعروں میں شرکت کررہے ہیں، وہ بنیادی طور پر اردو تہذیب سے نابلد ہیں۔ اردو رسم الخط سے ناواقفیت کی بنا پر بہک بھی جاتے ہیں۔ ان میں کچھ مسلم شعراء بھی شامل ہیں مگر مشاعروں کے گرتے ہوئے معیار اور عوامی مصنوعی مقبولیت کی غلاظت پر مخمل کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ کسی کو فرصت نہیں کہ ماضی کے ادبی اوراق پلٹ کر دیکھے۔ اب نہ گنگا جمنی تہذیب باقی ہے اور نہ وہ رواداریاں۔ آج کل شہرت کا زمانہ ہے۔ ادبی ورثے کے بیش قیمتی اوراق تو بہت پہلے دفن ہوچکے۔

❑❑❑

اصناف کا تصور اور اردو کی اصناف سخن

خان احمد فاروق

صدر شعبۂ اردو

حلیم مسلم پوسٹ گریجویٹ کالج

کانپور

رابطہ: 7309030097

''ایک بار ناسخ جب الہ آباد میں تشریف رکھتے تھے۔ اسی زمانہ میں ان کے ایک شاگرد شاہ غلام اعظم افضل الہ آبادی لکھنو کے لیے عازم سفر ہوئے۔ استاد ناسخ نے کہا بھئی آتش سے بھی ضرور ملتے آنا۔ آتش نے ان کے اعزاز میں ایک شعری نشست کا اہتمام کیا۔ نشست میں آتش نے غزل کا مطلع پڑھا:

حسن سے قدرت خدا کی رو نظر آیا مجھے
ریش پیغمبر ترا گیسو نظر آیا مجھے

افضل الہ آبادی ذرا ہٹ کر بیٹھے تھے۔ مطلع سنتے ہی اپنی جانب آہستہ سے لاحول ولاقوۃ کہا لیکن آتش نے سن لیا۔ ان کی طرف سر اٹھا کر ذرا تیز نگاہ سے دیکھا مگر مہمان کا خیال کر کے کچھ نہ کہا۔ افضل جب الہ آباد واپس آئے اور استاد ناسخ کو پورا واقعہ بیان کیا تو ناسخ بولے یہ کیا غضب کیا یہ تو منقبت کا شعر ہے تم غزل کا سمجھے۔''

(یہ واقعہ یا لطیفہ مجھے پروفیسر احمد محفوظ نے ایک سنایا تھا۔)

ہمارے عہد میں مختلف شعبہ ہائے علوم نے جہاں بہت سے راستے کھولے ہیں وہیں پیچیدگیاں اور مغالطے بھی پیدا کئے ہیں۔ لیکن پہلے سے کسی علم یا ایجاد یا شئے کے تعلق سے غلط آرا قائم کر لینا کسی بھی علمی معاشرہ کا وطیرہ نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ ہر ایجاد یا ہر علم اپنا ایک تہذیبی اور ماحولیاتی طور بھی رکھتا ہے۔ احتشام حسین صاحب جب راک فیلر فاؤنڈیشن کی دعوت پر امریکہ تشریف لے گئے تو کسی عشائیہ میں ان کی کچھ امریکی ادیبوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے کسی نے احتشام صاحب سے ہندوستانی اردو تنقید کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے سوال کیا کہ آپ کے یہاں کی تنقید کیسی ہے۔ احتشام صاحب نے جواب دیا ''جیسی آپ کے یہاں'' اس امریکی ادیب نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ ہماری تنقید تو ہماری تہذیبی ارتقاء سماجی و لسانی عوامل اور فکری تعینات کے تناظر میں ہوتی ہے۔ اردو میں ہماری جیسی تنقید کیسے ہوسکتی ہے۔ بہرحال اس کے اثرات دیر سویر ہمارے یہاں بھی دکھائی دینے لگے۔ اب تو خاص طور پر ہر فکر یا تھیوری کو من وعن اپنانے کے بجائے اس کو اپنے طور پر قابل قبول بنانے کی ضرورت پر زور دیا جاتا ہے۔

اس لئے اب یہ بحث یا تضیع اوقات کی موجب ہوگی کہ اصناف کے مطالعہ کے ضمن میں ہمیں کیا طور اپنانا چاہیے۔

اصناف کے تصور، ان کی کارکردگی یا ان کی حدود کے تعلق سے مغرب میں ارسطو سے لے کر اینس باورشی تک مختلف افکار سامنے آ چکے ہیں۔ اردو میں ۱۹۸۱ ''درس بلاغت'' میں شمیم احمد نے اور پھر ۱۹۸۴ میں شمس الرحمٰن فاروقی نے ''نظم کیا ہے'' میں اس پر خاصی مدلل گفتگو کی ہے۔ اردو میں اس سے پہلے یا بعد میں غالباً اس بحث کو قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اور اصناف کی ہیئتوں اور موضوع کو من وعن حرف آخر مان کر قبول عام بخش دیا گیا۔ فاروقی صاحب کی اس دلیل پر کہ ''ہر وہ منظومہ جو غزل نہیں ہے نظم ہے'' پر نہ کوئی رد عمل دکھائی دیا نہ قبول عام۔ ہم اپنی پہلے کی ڈگر پر قائم رہے یہاں تک کی جب انھوں نے ''داستان'' پر کام کرتے ہوئے فسانہء عجائب '' اور'' باغ وبہار'' کو ڈیڑھ دو سو برس پرانی چلی آرہی روایت کے برخلاف داستان ماننے سے انکار کر دیا تب بھی یہ سوال کسی نے نہ اٹھایا کہ صاحب ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ ہماری ساری ادبی روایت کو تلپٹ کیے دے رہے ہیں۔ بہرحال ہم اب فاروقی صاحب کو قبول کریں یا رد۔ لیکن اب یہ بحث ناگزیر ہو چکی ہے۔ ادھر تقریباً پندرہ بیس برسوں سے مغرب میں اس بحث پر خاصہ زور رہا ہے۔ اور اس کی خاص وجہ میڈیا کا تمام علوم کو حاوی ہونا ہے۔ اور یوں بھی ادھر بین العلوم مطالعات کی وجہ سے کسی خاص فکر ہی نہیں بلکہ کسی بھی شعبہ ہائے علم میں اٹھنے والے مباحث سے ادب کا اچھوتا یا دور دور رہنا ممکن نہیں ہے۔ اب اگر اکبرالہٰ آبادی ہوتے تو یہ شعر شاید نہیں دہراتے:

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردئی
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ھشیار باش

بلکہ دامن کو تر کرنے میں ہی عافیت جانتے۔ ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ادھر پندرہ بیس برسوں میں میڈیا اور سائنس خاص طور پر حیاتیاتی اور نباتیاتی سائنس کی ایجادات کی یلغار نے اصناف کے سلسلہ میں ایک نئی بحث چھیڑ دی ہے۔ میڈیا زیادہ سے زیادہ اپنے دائرۂ کار میں اضافہ کرنے اور بڑی تعداد میں سامعین/ناظرین کو اپنی طرف راغب کرنے کی خاطر اور اپنے 24x7 چینلس کو جگائے رکھنے کے لئے اپنے روز مرہ کے پروگرام میں نئے نئے اضافے کرنے پر مصر ہے۔ اور ظاہر ہے ہر نئے اضافے کے ساتھ پروگرام کو نیا نام بھی دینا چاہتا ہے تاکہ اس کے سامعین/ناظرین میں ان پروگرموں کے لیے دلچسپی قائم رہ سکے۔ نیا سے نیا پروگرام پرانے نام کے ساتھ اس کے ناظرین کو رموٹ کے ذریعہ چینلس تک لانے میں ناکام ہوتا ہے اور پروڈیوسر کے ذریعے لگائے گئے سرمائے پر ضرر کے امکانات میں اضافہ کرتا ہے۔ جس کی خاطر اس شعبے کے ماہرین نے اس سلسلہ میں اصناف کے دائرۂ کار، ساخت اور نام کی ایک غیر مختتم بحث شروع کر دی ہے۔ اور پھر جہاں سرمایہ کاری کا معاملہ ہو وہاں کسی سلسلے کا آسانی سے ختم ہونا ناممکنات میں ہے۔ یہی حال حیاتیاتی اور نباتیاتی سائنس کے شعبوں کا بھی ہے ۔ اس سلسلہ میں ادب اور اس کی اصناف بھی زیر بحث ہیں۔ مگر یہاں معاملہ میڈیا جیسا تو نہیں لیکن بہرحال یہاں بھی معاملہ اپنے اندر بہت سی پرتے لیے ہوئے تو ضرور ہے۔ تھوڑا پیچھے مڑ کر تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ یہ سلسلہ ارسطو سے چلا آتا ہے۔ اور بظاہر وہ جتنا شفاف اور سادہ نظر آتا ہے اتنا ہی پیچیدہ اور مغالطے سے بھرا ہے۔ ابتدا میں ادب تین حصوں میں منقسم تھا۔ نثر، نظم اور ڈرامہ، ۔ پھر مزید تقسیم ہوئی مثلاً ڈرامہ میں المیہ اور طربیہ کا ظہور ہوا۔ بہت بعد میں شیکسپیر نے اپنے ڈراموں میں ان اصولوں کی بھی خاصی دھجیاں اڑائیں۔ ڈیوڈ شینڈلر نے ہیملٹ کے II ایکٹ کے ii سین کا حوالہ دیتے ہوئے Tragedy, , pastoral, history,c o m e d y ,-pastoral histrical,pastoral-comical - tragical,tragical-historical pastoral.- historical-comical اصناف کی نشاندہی کی ہے۔ اس سے یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ ادب اور اس کی اصناف میں بہت زیادہ اصولوں کی پابندی کبھی کارگر نہیں رہی۔ لیکن اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ نئی اصناف کیسے وجود میں آتی ہیں۔ لیکن یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ اصناف خلاء میں نہیں پیدا ہوتیں لیکن ایک پیچیدگی اور سامنے آتی ہے کہ آیا یہ تخلیق کار کی کارکردگی ہوتی ہے یا قاری/نظریہ ساز کی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تشریح اور تفہیم کا معاملہ تو ہے نہیں۔ تحریر/قاری اساس تنقید یا بین المتونیت کے کسی نظریہ سے اس معاملہ کی ہر توجیح قابل قبول ہوگی بلکہ یہ متن کی ایک قسم سے رجوع کرنے کا عمل ہے جو شکلیات اور قسمیات سے تعلق رکھتا ہے۔ تو کیا اصناف شکلیات کی ایک محدود درجہ بندی کا نام ہے یا پھر کسی ایسے اصول کی پابند ہیں جس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ جیسے تخلیق کاروں کے اظہار کے طریقوں پر کوئی حد قائم نہیں ہوتی ۔ کیا اصناف افلاطونی جوہر کی طرح وقت کے ہر سیل رواں میں بھی قائم رہتی ہیں یا پھر ان کا وجود عارضی ہوتا ہے۔ یا پھر اصناف قائم بالذات ہوتی ہیں یا کسی خاص تہذیبی علاقے کی پابند ہوتی ہیں یا اس سے ماورا۔ کیا اصناف کا کوئی وضاحتی تجزیہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ایسے بہت سے سوال اب ہمارے سامنے ہیں۔ کیوں کہ پچھلے دو ہزار سال میں وجود میں آنے والی اصناف اور قسمیات کا ان کے طریقۂ کار کے حوالے سے جو مطالعہ سامنے آیا ہے اس پہ ہم سب متفق ہیں۔ کیا دنیا کے تمام ادب کی تقسیم اور ان میں پائی جانے والی اقسام کا نام رکھنا بہت ضروری ہے۔ لیکن اب تک شاید اصناف کی درجہ بندی کے لئے ہمارے پاس کوئی معروضی اور غیر جانبدارانہ طریقۂ کار نہیں ہے اور نہ ایسا ممکن معلوم ہوتا ہے کہ کوئی غیر متنازعہ نظام اس سلسلے میں قائم ہو سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ

کچھ مخصوص اصناف کے تعین/تعریف کے سلسلہ میں نظریاتی اختلاف اکثر نہیں ہے۔لیکن وہ بھی ایک حد تک کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی صنف کسی کے لیے ذیلی صنف تو کسی کے لئے اعلیٰ/ارفع/بالا ((super صنف ہوسکتی ہے۔اردو میں یہ تصور عام نہیں ہے لیکن شمس الرحمن فاروقی نے نظم کو ایک اعلیٰ صنف مانا ہے۔اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تکنیک، اسلوب، طرز، موضوع کے لحاظ سے صنف کے مقررہ طریقہ کار میں تبدیلی لازمی ہے۔اس لیے بہر حال کسی صنف کے دائرۂ کار کو متعین کرنے کے لیے نہ تو موضوع اور نہ ہی ہیئت بنیادی طور پر کام آتے ہیں۔جیسا کہ درس بلاغت میں شمیم احمد اقسام شعر کے متعلق لکھتے ہیں۔

'اردو میں اصناف سخن یا اقسام شعر کی شناخت اور درجہ بندی کے لئے کسی منطقی اصول سے کام نہیں لیا گیا ہے (کیا کسی دوسری زبان میں لیا گیا ہے)۔۔۔کسی خاص صنف سخن کی شناخت ہم اصولاً موضوع کو بنائے ترجیح قرار دیں یا محض ہیئت کو اردو میں بالعموم اصناف کا تعین ہیئت کی بنا پر ہوا ہے۔(لیکن اکثر کبھی موضوع اور کبھی ہیئت سے اصناف متعین ہوتی ہیں) موضوع کی بنا پر اصناف (مثلاً مرثیہ، واسوخت، شہر آشوب،) کی شناخت محض روایتی ہے۔ہیئت کی بنا پر اصناف سخن کی درجہ بندی کا بہر حال ایک منطقی جواز ضرور ہے اور وہ یہ کہ اس طرح اصناف کی تعداد محدود اور قابو میں رکھی جاسکتی ہے۔'

اس کے بعد وہ اقسام شعر کی درجہ بندی یوں کرتے ہیں۔

۱۔ وہ اصناف سخن جن کی شناخت مساویانہ طور پر موضوع اور مثبت سے ہوئی انہیں ہم اصطلاحاً موضوعی ہیئتی اصناف کا نام دیں گے۔مثلاً مثنوی، قصیدہ

۲۔ وہ اصناف جو محض اپنی مخصوص ہیئت کی بنا پر اپنی شناخت رکھتی ہیں انہیں اصطلاحاً ہیئتی اصناف کہا جائے گا۔مثلاً غزل، رباعی

۳۔ وہ اصناف جنہیں ہم محض ان کے موضوع کی وجہ سے پہچانتے ہیں اصطلاحاً موضوعی اصناف کہلائیں گی۔مثلاً مرثیہ، واسوخت، شہر آشوب

۴۔ وہ اصناف جن کی شناخت نہ موضوع پر منحصر ہے نہ ہیئت پر بلکہ وہ اپنے مخصوص تہذیبی و تمدنی مزاج کی بنا پر صنف کا درجہ پاتی ہیں مثلاً نظم اور گیت''

اس انداز میں بہت پہلے معروف ادبی نظریہ ساز نارتھروپ فرائے اپنے مضمون The Anatomy of criticism میں کچھ آفاقی اصناف اور طرزوں کو تمام ادبی متون کو منضبط کرنے کے لئے

''اردو میں اصناف سخن یا اقسام شعر کی شناخت اور درجہ بندی کے لئے کسی منطقی اصول سے کام نہیں لیا گیا ہے (کیا کسی دوسری زبان میں لیا گیا ہے)۔۔۔کسی خاص صنف سخن کی شناخت ہم اصولاً موضوع کو بنائے ترجیح قرار دیں یا محض ہیئت کو اردو میں بالعموم اصناف کا تعین ہیئت کی بنا پر ہوا ہے۔

بطور کلید پیش کیا ہے۔یہ تو شعر کی بات ہوئی نثر میں بھی ہم اگر کسی کی سوانح/سوانحی ناول کے بارے میں کیا کہیں گے۔اس میں صرف اس خاص مصنف کے حالات کے بارے میں ہی معلوم نہیں ہوتا۔تاریخ بھی ہوتی ہے اور قصہ گوئی بھی۔اور بھی بہت کچھ ایسا ہوتا ہے جو دوسری اصناف نثر میں بھی موجود ہوتا ہے جس کو آپ کسی ہیئت یا ساخت یا موضوع میں قید نہیں کر سکتے۔ایک زمانہ تھا ممتاز مفتی کا ناول ''علی پور کا ایلی'' اردو ناولوں میں اپنا ایک خاص مقام رکھتا تھا۔اس کو شائع ہوتے ہی پاکستان کا سب سے بڑا انعام بھی ناول کے نام پر ملا۔سیکڑوں نے اظہار خیال بھی ناول سمجھ کر کیا۔بعد میں معلوم ہوا کہ صاحب وہ تو سوانح تھی۔چلیے سوانحی ناول کا درجہ دے دیا۔لیکن جن لوگو ں نے صرف ناول سمجھ کر پڑھا یا لکھا۔وہ تحریریں کیا ہونگی۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مصنف تخلیق کار کی کی بتائی ہوئی (بات) صنف پر ہی قاری تکیہ کرے یا قاری/نقاد کو بھی حق حاصل ہے کہ تخلیق کی صنف کا تعین کرنے میں۔عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ ہم جس صنف کو پڑھتے ہیں۔ہمارے ذہن میں پہلے اس صنف کی جو شعریات کا تصور موجود ہوتا ہے اسی بروئے کار لاتے ہیں۔لیکن پھر اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو میں زمانے سے میلاد کا تصور نظم میں بھی ہے اور نثر میں بھی۔اور ہم نے یہ تو مان ہی لیا ہے کہ نظم اور نثر میں اصناف الگ الگ ہوتی ہیں۔ان کی شعریات الگ الگ ہوتی ہیں۔اردو ناول اور افسانہ کی تنقید پر بہت زمانہ تک الزام لگتا رہا کہ صاحب اردو والے شاعری کی شعریات یا اصولوں پر ان دو کو بھی پرکھتے ہیں جو کہ سراسر غلط طریقہ ہے۔تو پھر میلاد کا کیا ہوگا۔اور اس کو ہم صرف مذہبی صنف کہہ کر اپنا دامن نہیں چھڑا سکتے کہ حالی کا مولود شریف دامن پکڑتا ہے۔قصیدہ تو ہم نے عربی سے لیا (جب کہ فاروقی صاحب کا کہنا ہے کہ عربی میں قصیدہ نام کی کوئی صنف ہے ہی نہیں) لیکن موضوع کے اعتبار سے دونوں میں کوئی علاقہ نہیں ہے۔جو سب پر ظاہر ہے۔ابھی حال میں ہی انگریزی ناول/ہیئت کی معروف سیریز ہیری پوٹر کو Fantasy, young-adult fiction, mystery, thriller, Bildungsroman, magical realism اصناف سے موسوم کیا جارہا ہے۔یہ روایتیں کیا یہ نہیں ثابت کرتی ہیں کہ اصناف اور اس کے اصولوں میں کوئی واضح ربط نہیں ہے۔تخلیق کار کے خیالات کی طرح ہر پابندی اور قید سے آزاد ہیں۔ہاں یہ سوال ضرور کیا جا سکتا ہے کہ پھر ان کی شناخت کیسے قائم ہوگی۔کیا کوئی ایسا ضروری اور کافی شافی نظام قائم نہیں کیا جا سکتا جو مصرعوں یا ارکان کے مجموعے یا جملوں کے ٹکڑوں کو کسی ایسی قید میں باندھ سکیں کہ قاری

کے لیے تشفی بخش ہو۔ کیا کبھی یہ صورت حال بھی ہمارے سامنے آسکتی ہے کہ تخلیق کار اور قاری/نقاد/نظریہ ساز اپنی آسانی کے لیے تخلیق کو کوئی بھی نام دے سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ ایک نئی پیچیدگی کو لے کر سامنے آئے گا۔ ابھی اردو میں پچھلے دنوں ہمارے دو اہم ادیب اور شاعر ذاتی سانحات سے گزرے، اس حادثے پر دونوں نے اپنے تخلیقات میں اظہار خیال کیا۔ منیب الرحمٰن نے نظموں میں اور اس کا نام دیا ہجر وفراق کی نظمیں اور فاروقی صاحب نے غزلوں میں۔ ان کی ۱۲ غزلوں میں، ہر غزل میں نو شعر ہیں۔ جبکہ ردیف اور قافیہ بدلا ہوا ہے۔ اور یہ غزلیں ایک عنوان کے تحت ''ایک شخص کے تصور سے'' شائع ہوئیں۔ اردو میں غزلوں پر عنوان لگانے کی روایت رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مسلسل غزلیں بھی نہیں ہیں لیکن ایک کیفیت اور جذبے کا اظہار ہے۔ اس کو کس صنف کا درجہ دیں گے۔ باقر مہدی بھی اپنی آخری زمانوں کی غزلوں میں کالی غزل کا عنوان لگاتے تھے۔ احتشام حسین کی بھی اس طرح کی غزلیں شائع ہوچکی ہیں۔ ظاہر ہے یہاں صرف مقصد روایتی غزل کہنا نہیں ہے بلکہ قاری کو ایک خاص کیفیت تک لانا بھی ہے۔ تو کیا کسی خاص مقصد کے تحت موضوع یا ہیئت بدلنے سے صنف میں تبدیلی واقع ہوسکتی ہے۔ ایک مثال ہمارے سامنے ہے۔ جب نظیر اکبر آبادی نے اپنی روایت سے الگ ہٹ کر کچھ کہا۔ جس کا اس عہد کے لوگوں نے تذکرہ بھی ضروری نہ سمجھا۔ حالانکہ اس کا انداز ہماری پابند نظم کی طرح تھا۔ بہت بعد میں جب انجمن پنجاب کے تحت ہالرائیڈ کی نگرانی میں آزاد اور حالی نے اسی انداز کی شاعری شروع کی تو اس کا نام ''نظم جدید'' رکھا۔ میرا یہ ماننا ہے کہ ہالرائڈ کو یہ احساس تھا کہ اردو میں اس انداز کی شاعری موجود ہے۔ لیکن اس کو تو انگریزی شاعری کا اثر ونفوذ اردو شاعری پر دکھانا تھا دوسرے بچارہ حالی اور آزاد جانتے ہوئے بھی کیا کر سکتے تھے کہ وہ صرف ملازم تھے۔ ہاں اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لیے یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ اردو شاعری میں جدید اقدار کے تحت اس شاعری کا نام ''نظم جدید'' رکھا گیا۔ یہ الگ معاملہ ہے کہ نظیر کی وہ شاعری بعد میں نظم کے نام سے موسوم ہوئی۔ اور بعد میں انجمن پنجاب والی شاعری سے اپنے عہد کی شاعری کو الگ کرنے کے لئے خلیل الرحمٰن اعظمی نے اس نظم کو جدید تر شاعری کہا۔ جس میں غزل کے علاوہ پابند، معرا، آزاد اور نثری نظم بھی شامل تھی۔ اور یہ ساری کوشش قسمیات اور شکلیات کے علاوہ موضوع کے سلسلے میں تھیں۔ یہاں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ انجمن پنجاب والی نظموں کا رشتہ انگریزی کے حوالے سے تھا۔ اور یہ معاملہ آج بھی ہمارے پیش نظر رہنا ضروری ہے۔ اس طرح اصناف اور ان کا تصور ایک دوسرے میں خلط ملط ہوجاتا ہے۔ ان کو وجدانی طور پر آسانی سے شناخت تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی ایک دوسرے سے الگ واضح تعریف نہیں ہوسکتی۔ یعنی صنف کی منفرد خصوصیت جو عام طور سے اس مخصوص ہو۔ اور اس کے باہمی امتیاز، مشابہت اور طریقہ کار کو واضح کرے۔ اور یہ انداز یا طریقہ اصناف کے ضمن میں ان کی اہمیت کو کم کرکے پیش کرنے جیسا ہے۔ اومزید یہ اصناف کے سلسلہ میں تکرار کی مثال جیسا ہے۔ جب کہ Steave Neale کے مطابق ''اصناف کے سلسلہ میں افتراق کی وضاحت کفایت شعاری کی طرح لازمی ہے'' کیونکہ بقول شخصے'' اس طرح کی تکرار قاری کے لئے بے زاری کا سبب ہوسکتی ہے''، لیکن یہ بات میڈیا کے تعلق سے تو قابل قبول ہوسکتی ہے لیکن ادبی اصناف کے لیے قطعی نہیں۔ اس سلسلہ Todorov Tzvetan مزید زور دے کر کہتا ہے کہ'' Any instance of genre will be neccessarily difference اور اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ اصناف کے متون اکثر اپنی رسومیات کو ظاہر کردیتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے مختلف اوقات میں مختلف اصناف میں ایک جیسے متن بھی ممکن ہو سکتے ہیں (جیسے میلاد کی مثال)۔ لیکن اردو میں ابھی ایسی غیر یقینی اور متنازع صورت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اور اس کی وجہ جو مجھے معلوم ہوتی وہ یہ ہے کہ ابھی اردو میں ایسے تخلیقی تجربے ہونے ہیں جو ہمیں ایسی صورت حال سے

نیا دور کے مختلف نمبر کتابی شکل میں

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے 'اودھ نمبر، محمد علی جوہر نمبر اور مجاز نمبر' بھی شامل ہے۔ پہلے اسے الگ الگ شائع کیا گیا تھا لیکن اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ ادب وتاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعہ ای میل رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰/روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپئے ملا کر کل قیمت ۲۵۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

دو چار کریں ۔ابھی تک تو ہم جس زبان سے جو صنف حاصل کرتے ہیں اس کا وہی نام رکھ لیتے ہیں مثلاً سانیٹ، ہائیکو۔ مغرب کے بعض نظریہ ساز متون کے لحاظ سے خاندانی مشابہت کے طور پر درجہ بندی پر زور دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کا ماننا ہے کہ کسی صنف میں ایک منفرد متن شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہے۔ جب کہ عام طور پر اصناف کی خصوصیات کو سامنے رکھ کر ہی بات کی جاتی ہے ۔ خاندانی مشابہت کا نقطہ نظر رکھنے والے نظریہ ساز مختلف اصناف میں متن کی مماثلت پر غور و فکر کرنے کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔لیکن اس نقطۂ نظر کو شدید مخالفت کا سامنا ہے۔ بقول David lodge

''No choice of a text for illustrative purpose is innocent''

لیکن ان مسائل کا حل اپنے آپ میں خود ایک بڑا مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔ یہ تذبذب اور انتشار کیسے دور ہو سکتا ہے کیا اس سلسلہ میں کوئی ایک ضابطہ سب کے لیے قابل قبول ہوگا۔

یہ تو بہر حال ماننا ہوگا کہ اصناف کسی ایک نظام کی پابند نہیں ہوتیں بلکہ یہ سارا سلسلہ ابھی بھی نظم بندی کے عمل میں ہے روایتی طور پر اصناف (خاص طور پر ادبی اصناف) ایک مقررہ فارم کی مانی جاتی ہے لیکن ساتھ میں اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے افعال اور فارم حرکی ہوتے ہیں اور کسی تہذیبی عمل سے وجود میں آتی ہیں۔ بلکہ مباحث اور تبدیلی کے مسلسل عمل سے ان کا وجود ہوتا ہے۔ اسی لئے اصناف کی ہیئت اور ساخت میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ کسی صنف کے لئے کوئی بھی ہیئت اور ساخت اور موضوع مستحکم نہیں مانی جا سکتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ابتک اصناف کے معاملے میں کوئی فریم ورک مقرر نہیں کیا جا سکا۔ ہر صنف میں مسلسل توسیع اور تبدیلی ہو رہی ہے اور اصناف کے باہمی ہیئتی اور موضوعی تعلقات زمانے کے ساتھ تبدیل ہو رہے ہیں۔ اس کی رسومیات بدل رہی ہیں۔ نئی اصناف اور ان کی ذیلی اصناف وجود میں آتی رہتی ہیں۔ تاہم اصناف کی رسومیات کی تبدیلی میں تخلیق کاروں کے تجربوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہی اس پر قادر ہیں۔ میڈیا یا دوسرے تکنیکی علوم کی طرح سامعین یا اس کے برتنے والوں کے نقطہ نظر یا دلچسپی کو ذہن میں رکھ کر ادبی اصناف میں تبدیلی نہیں ہوتی ۔ خاص طور پر میڈیا کے ماہرین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کچھ اصناف دوسری اصناف سے زیادہ قوت رکھتی ہیں لیکن ادبی اصناف کے تعلق سے یہ بات بھی نہیں کہی جا سکتی۔ یہاں تخلیق کار کی تخلیقی اپج ہی صنف کا انتخاب کرتی ہے۔ اکثر تخلیق کار نثر و نظم کو چھوڑ کر یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کی تخلیق کی کیا صورت ہوگی اور نہ ہی دوسرے اداروں کی طرح ادبی اصناف میں ہمیں کوئی باہمی تنازعہ نظر آتا ہے اور نہ ہی ادب میں کوئی ایسا ادارہ قائم ہو سکا ہے۔ جو اصناف کی تعریف یا فریم ورک متعین کرنے کا حکم رکھتا ہو جبکہ دوسرے شعبہ ہائے علوم میں ان کی تعریف متعین کرنے میں اداروں کا کلیدی کردار ہوتا ہے۔ جیسا کہ میڈیا رپورٹوں میں ، یہ ان کا ادارہ ہی طے کرتا ہے کہ کسی issue کو ایئر کرنے سے پہلے اس کا فریم ورک طے کیا جاتا ہے۔ اور اب تو بین المتونیت کے نظریہ کے استحکام کے بعد کسی بھی متن کو ایک سے زیادہ نظریہ سے دیکھا جانے لگا ہے۔ اور اسی لئے کہ Katie Wales اصناف کو متون کا باہمی رابطہ تصور کرتی ہے۔

اس ضمن میں Tony Thwaites کی بات زیادہ قابل قبول محسوس ہوتی ہے

' each text is influenced by generic rules in the way it is put to gether;the generic rule are reinforced by each text.'

لیکن اس کے بعد بھی انیس باورشی حق بجانب معلوم ہوتے ہیں:

This recursive process
is what genre is.

❑❑❑

اودھ نمبر کتابی شکل میں

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک 'اودھ نمبر' بھی ہے جسے دو حصوں شائع کیا گیا تھا۔ اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰/روپے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپے ملا کر کل قیمت ۲۵۰/روپے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

خودنوشت سوانح نگاری کا نسائی زاویہ

(بُری عورت کی کتھا اور جنّت سے نکالی ہوئی حوّا: ایک مطالعہ)

سید وجاہت مظہر

T-116/1, 2nd Floor

مین مارکیٹ، اوکھلا ویلج

نئی دہلی

رابطہ: 7217718943

ادب کی کوئی بھی صنف ہو بلکہ سارا ادب ہی اپنے آخری تجزیے میں دراصل فنکار کی آپ بیتی ہی ہوتا ہے۔ محض ادب ہی نہیں بلکہ دیگر فنونِ لطیفہ، رقص، موسیقی اور مصوری کا بھی یہی حال ہے۔ آپ بیتی کا عنصر ہی تمام فنونِ لطیفہ کا محور ہے۔ آپ بیتی جب ایک مستقل تصنیف کی شکل میں ہو اور جب وہ مصنف کی خودنوشتہ داستانِ حیات ہو تو اسے انگریزی میں autobiography اور اردو میں خودنوشت سوانح عمری کہتے ہیں۔

بائیوگرافی دراصل لفظ bios سے بنا ہے جس کے معنی ''زندگی'' کے ہیں اور graphier کے معنی ''لکھنا'' ہے اور اس لفظ میں auto کو جوڑنے سے یہ نئی اصطلاح autobiography مورِ وجود میں آئی ہے جسے ہم اردو میں خودنوشت سوانح عمری یا خودنوشت سوانح حیات یا آپ بیتی کہتے ہیں۔

کیسل کے ''انسائیکلو پیڈیا آف لٹریچر'' میں اس صنفِ ادب کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے، ''خود نوشت انسان کی وہ روداد ہے جسے وہ خود بیان کرتا ہو۔ اس میں سوانح حیات کی کسی بھی دوسری شکل سے زیادہ صداقت کی ضمانت ہونی چاہئے۔ کیونکہ کتاب کی مرکزی شخصیت ایسے گواہ کے طور پر پیش ہوتی ہے جسے وہ خود قلمبند کرتا ہے۔

''وہاج الدین علوی نے اپنی کتاب ''اردو میں خودنوشت سوانح: فن و تجزیہ'' میں خودنوشت سوانح عمری کی مبسوط تعریف بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''خودنوشت سوانح حیات ادب کی وہ تخلیقی صنف ہے جو کسی فردِ واحد کی زندگی کے اہم ادوار پر محیط ہوتی ہے اور اسی کے قلم کی رہینِ منت ہوتی ہے جسکے آئینے میں اس فرد کی داخلی اور خارجی زندگی کا عکس براہِ راست نظر آتا ہے اور اس کا عہد بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔''

(وہاج الدین علوی، اردو میں خودنوشت سوانح: فن و تجزیہ، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، 1989، صفحہ 41)

ڈاکٹر صبیحہ انور اپنی کتاب ''اردو میں خودنوشت سوانح حیات'' میں آپ بیتی کے فن کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے یوں قلم طراز ہیں:

''دراصل ہر تخلیق، خالق کی شخصیت، اس کے مزاج، عادات، افکار اور عقائد کا نچوڑ ہوتی ہے۔اس کے بغیر وہ بے روح اور کھوکھلی ہوتی ہے ۔فنی اعتبار سے ایک خودنوشت تاریخی ہی نہیں ادبی کارنامہ بھی ہوتی ہے ۔افسانے میں افسانے کو حقیقت کے قریب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور خودنوشت سوانح حیات میں حقیقت خوبصورت الفاظ میں سامنے آتی ہے۔آپ بیتی میں بے باک سچائی اور خلوص کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔اس کی غرض، شخصیت کو پیش کرنا ہے اور لازمی یہ ہے کہ تصنیف شخصیت کو واضح کردے اور فن کا تقاضہ بھی یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے صفائی اور سچائی کے ساتھ پیش کیا جائے۔''

(اردو میں خودنوشت سوانح حیات، ڈاکٹر صبیحہ انور، نامی پریس لکھنؤ، 1982، صفحہ 41)

جب ہم خواتین کی تحریر کردہ خودنوشت سوانح عمریوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان میں ماحول و مسائل کی ایک الگ دنیا ملتی ہے۔برِصغیر ہندو پاک میں زندگی کے الگ الگ میدانوں سے وابستہ خواتین نے اس صنف ادب میں خوب طبع آزمائی کی ہے۔ان آپ بیتیوں میں شعبۂ تعلیم، صحافت اور دیگر علوم وفنون سے منسلک خواتین کی زندگیوں اور ان کے جذبات و احساسات کا عکس ملتا ہے۔یہ خودنوشتیں پدرسری نظام اور معاشرتی جبر واستحصال کے خلاف خواتین میں پائے جانے والے احتجاج کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔خواتین آج خاموشی سے سب کچھ سہنے کے بجائے علمِ بغاوت بلند کرنے پر آمادہ دکھائی دیتی ہیں۔اپنی تحریروں کے توسط سے وہ اپنی خاموشی توڑنے کا جذبہ ظاہر کرنا چاہتی ہیں۔ایسی خودنوشتیں خواتین کی بیداری کی مہم کا حصہ تسلیم کی جاتی ہیں ۔خواتین نے ہر سطح پر چاہے وہ اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی ہوں، چاہے متوسط یا نچلے طبقے کی نمائندگی کرتی ہوں، سبھی نے سماج سے اپنی جدو جہد اور سنگھرش کی داستانیں بیان کی ہیں۔وہ اپنی ذات کے توسط سے سوسائیٹی کی تعلیم وترقی کے باعث برپا ہونے والی اقدار کی اُتھل پُتھل، اذیت و جبر کو سہتے ہوئے بھی نسائی جرأت مندی کے واقعات وسانحات سے ہمیں روشناس کراتی ہیں۔

تعلیم نسواں اور خواتین کے حقوق کے شعور کے ساتھ خواتین کی تحریر کردہ خودنوشتیں منظرِ عام پر آنے لگیں۔علم کی روشنی کے ساتھ عورتوں کو گھروں کی چہار دیواری سے باہر نکلنے اور کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع ملنے لگا۔خواتین میں ایک طرف مختلف اصنافِ سخن اور فنونِ لطیفہ میں طبع آزمائی شروع کی تو دوسری طرف سماج کی بندشوں سے چھٹکارا پانے کی جدو جہد بھی کی۔لہٰذا جب انہوں نے آپ بیتی لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو ان میں پدرسری سماجی ڈھانچے اور دقیانوسیت کے خلاف احتجاج کے جذبے کی کارفرمائی شعوری یا لاشعوری طور پر اجاگر ہوئی۔اکثر خودنوشت نگار خواتین نے گھٹن کے ماحول میں آنکھیں کھولیں۔انہوں نے معاشی نقطۂ نظر سے خوشحال گھرانوں میں بھی قدامت پرستی، لڑکیوں کی تعلیم کے تئیں عدم توجہی اور مردوں کے ساتھ امتیازی برتاؤ کی روش عام پائی۔لیکن برِصغیر ہند و پاک میں آزادی کے بعد خواتین کے لیے حالات رفتہ رفتہ سازگار بنتے گئے اور نتیجتاً ان میں خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ حصولِ آزادی کے بعد زندگی کے سبھی شعبوں میں سرگرمیاں بڑھیں اور ملک میں ترقی اور اعتماد کی لہر دوڑ گئی۔آزادی کی فضا قلم کاروں کو بھی بڑی راس آئی۔قلم کی آزادی اور صنفی مساوات سے متعلق حقوق کے آئینی تحفظات کے باوجود خواتین ،مرد اساس معاشرے میں اپنے حقوق کے لیے صدائے احتجاج بلند کرنے میں اتنی کامیاب نہیں ہو سکیں جتنا ان کا حق تھا۔انہوں نے اپنی بات کہنے میں بھی جھجک اور سماجی بندشوں کو محسوس کیا۔خواتین قلمکاروں نے دوسروں کے احساسات اور مسائل کی ترجمانی کی لیکن اپنے دکھ درد اور اپنے ساتھ پیش آنے والی زیادتیوں اور اپنے ذاتی جذبات وتجربات کو بیان کرنے میں وہ قاصر رہیں۔

لیکن کچھ خواتین نے پہل کی۔ڈرے سہمے لہجے ہی میں انہوں نے اپنی بات کہنے کی جسارت کا سلسلہ شروع کیا۔مذہب وسماج کے خوف کے باوجود خواتین نے صنفی عدم مساوات اور حقوقِ نسواں کی لڑائی لڑنا شروع کیا۔دنیا کی بیشتر زبانوں میں خواتین نے خودنوشت سوانح عمریاں لکھنے کی جسارت کی اور خوف کے باوجود اپنے درد کی کہانیاں رقم کیں۔انہوں نے خارجی عوامل کے ساتھ ساتھ اپنی داخلی زندگی کے حالات بھی لکھے۔خواتین نے تعلیم کے حصول کے ساتھ زندگی کے مختلف شعبوں میں دلچسپی لی اور اپنے احوال آپ بیتیوں کے توسط سے عوام الناس تک پہنچائے۔اعلیٰ، درمیانی اور ذیلی طبقات کی خواتین نے اپنی زندگی کے مزاحمتی پہلو کو بھی موضوع بنایا۔اور رفتہ رفتہ یہ مزاحمت، جہد اور بغاوت میں تبدیل ہوتی گئی۔بعض نے شعلہ زبانی کا مظاہرہ کیا تو بعض خواتین نے ایسے موضوعات منتخب کیے جو اب تک ممنوعہ تھے۔انہوں نے جنسی جذبات سے متعلق بھی بے خوفی سے لکھا۔بیواؤں کے ساتھ سماج کی زیادتیوں، شوہر کے ظلم و جبر وغیرہ بھی سوانحی کتب میں شامل ہونے لگے۔خواتین کی آپ بیتیوں میں مزاحمت، احتجاج، افسردگی، بےچینی، اداسی، تنہائی، دکھ درد اور کسک ملتی ہے۔

شبانہ سلیم اپنے مضمون بعنوان ''خواتین کی اردو خودنوشت کا طرزِ نگارش'' میں برِصغیر کی سماجی ساخت میں خواتین کی صورتِ حال کا ہمدردانہ تجزیہ پیش کرتی ہیں۔وہ متوسط طبقے کی خواتین میں گھٹن اور اضطراب کی کیفیت ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں:

''غرض ان عورتوں کی جرأت قابلِ داد

ہے کہ گھٹے ہوئے ماحول میں آنکھ کھولی اپنے چاروں طرف قدامت کا حصار دیکھا،لڑکیوں کی تعلیم کی طرف سے اہلِ خانہ کی بے توجہی دیکھی،لڑکوں کے ساتھ امتیازی سلوک دیکھا اور مردوں کی فضیلت والے اس سماج میں وہ قطرہ قطرہ غیر محسوس طور پر زہر پیتی رہیں۔اور پھر جب آزادی کی نعمت آئی تو یہ سب ہی اپنے اپنے اس ماحول سے الگ ہونے پر مجبور ہوئیں جہاں پیدا ہوئی تھیں اور بڑی ہو رہی تھیں۔آزادی ملکوں کے لیے آئی تو آئی ہی،ان خواتین کے لیے تو بہت با معنی بن کر آئی جن پر زندگی کی کھلی ہوا میں سانس لینے کے دروازے کُھل گئے۔ان کے قلم جاگے اور انہوں نے لکھا اور خوب لکھا۔شاعری، افسانہ، ناول اور جب خود اعتمادی آ گئی،طبیعتوں میں ٹھہراؤ آ گیا،بات کو کہنے کا سلیقہ آ گیا،اپنے تجربات کو ناول نگاروں کی طرح 'حدیثِ دیگراں' کی طرح نہیں بلکہ اپنی ہی زندگی کی حقیقت کی طرح بیان کرنے کی جرأت آ گئی،نہایت شائستگی کے ساتھ ادبی زبان میں اپنے بزرگوں کے رویوں پر تنقید کرنے کا سلیقہ آ گیا تو ان خواتین نے خودنوشتیں قلمبند کیں اور اردو ادب میں اہم اضافہ کیا۔''

(یک موضوعی مجلہ 'اندازِ بیاں'، نئی دہلی، مئی 2016، صفحہ 261)

امرتا پریتم کی 'رسیدی ٹکٹ'، پدما سچ دیو کی 'بوند باوڑی'، کشور ناہید کی 'بُری عورت کی کتھا'، سعیدہ احمد کی 'ڈگر سے ہٹ کر'، اداجعفری کی 'جو رہی سو بے خبری رہی'، اجیت کور کی 'خانہ بدوش'، کُسُم انسل کی 'جو کہا نہیں گیا'، کرشنا اگنی ہوتری کی 'لگتا نہیں ہے دل مرا' اور نفیس بانو شمع کی 'جنت سے نکالی ہوئی حوا' بڑی منفرد سوانح عمریاں ہیں۔ان سوانح عمریوں میں ہمیں خواتین کی تخلیقی اظہارِ ذات و کائنات کے علاوہ ان پر کیے جانے والے ظلم و جبر کے خلاف احتجاجی آواز کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔

خودنوشت سوانح عمریوں کا مجموعی طور پر جائزہ لیں تو ہنسا واٹکر، پاربتی ایچ ویل، بہینہ بائی نے مراٹھی زبان میں اور اجیت کور وامرتا پریتم نے پنجابی میں، بینو دیوی گاسی، بینا داس، سرلا بیدی، اشوکا گپتا اور کنّن دیوی نے بنگالی زبان میں قابلِ ذکر آپ بیتیاں لکھیں۔ ان کے علاوہ کملا داس، شوبھا ڈے، مرنال پانڈے، دلیپ ٹُوانا، کرن بیدی، اندرا گوسوامی، سیتا دیوی لکشمی بائی تلک، لیلا سیٹھ، شرن جیت، آشا میرو، دینا نائیڈو کی خودنوشت سوانح عمریوں کے میدان میں اپنی منفرد شناخت قایم ہوئی۔عربی زبان میں خواتین خودنوشت نگاروں میں نوال السعداوی کی آپ بیتی ''مذکراتِ طبیبۃ'' اولین آپ بیتی تسلیم کی جاتی ہے۔یہ کتاب 1965 میں شائع ہوئی۔اس کے بعد خواتین نے یکے بعد دیگرے کئی اہم سوانحی کُتب قلمبند کیں جن میں معروف فلسطینی ادیبہ و شاعرہ فدوی طوقان کی کتاب ''رحلۃ جبلیۃ''، ''رحلۃ صعبۃ'' اور عراقی شاعرہ نازک ملائکہ کی زندگی کے احوال پر مبنی کتاب ''سیرۃ من حیاۃ نازک الملائکۃ'' بڑی اہمیت کی حامل سوانحی کتب تسلیم کی جاتی ہیں۔ان تمام آپ بیتیوں میں خواتین کے مسائل کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے۔

رشیدہ عیاں نے ''میری کہانی'' عنوان سے حمایت علی شاعر کے انداز میں منظوم خودنوشت سوانح عمری لکھنے کی بھی کامیاب سعی کی۔رشیدہ عیاں نے اپنی اس خودنوشت کے دیباچے میں آپ بیتی لکھتے وقت عورتوں کے جذبات و احساسات کو اس طرح بیان کیا ہے:

''دنیا میں کہی سنی بات یہی ہے کہ اپنی داستانِ حیات لکھنا آسان کام نہیں،انگاروں پر چلنے کے مترادف ہے۔صداقت کے پتھروں پر جب زندگی کے قدم پڑتے ہیں تو پاؤں سے روح تک چھل کر زخمی ہو جاتے ہیں اور جب لہو بہتا ہے۔۔تو وہی لکیریں تحریر بن جاتی ہیں۔۔میں تو یہ دیکھتی ہوں کہ دنیا چھوٹی کہانیاں اتنی دلچسپی سے پڑھتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔۔تو پھر سچی داستانیں۔۔ان کی بات ہی کیا ہے۔۔ان میں تو زندگی کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔اب گر سچ کی راہ پر پاؤں زخمی بھی ہوں تو ہم جیسوں کو کیا فرق پڑتا ہے۔سوچتی ہوں ہم عورتیں تو زمانۂ قدیم سے پتھریلی راہوں پر چلتی آئی ہیں اور آگ پر چل کر اگنی پریکشا دیتی رہی ہیں۔ہم جیسوں کے لیے کیا پتھر، کیا انگارے۔یہ زندگی تو سب سے بڑی معلمہ ہے۔پتھروں پر چلنا، کڑوے گھونٹ پینا، حصارِ آتشیں ماحول سے گزرنا سکھا دیتی ہے۔اس کی تپتی کی ساڑھ جسم پر نہیں، روح پر پڑتی ہے۔جسم تو بظاہر سجا سنورا اور خوبصورت تاج محل نظر آتا ہے لیکن روح میں تمناؤں اور جذبوں کے قبرستان کی ویرانی ہُو ہُو کرتی ہے۔''

(میری کہانی، رشیدہ عیاں، ماخوذ از 'دیباچہ' اشارات، کراچی، 2004)

اول الذکر خودنوشتوں کے علاوہ بھی بڑی تعداد میں خودنوشت سوانح عمریاں منظرِ عام پر آئیں۔ان میں زہرا داؤدی کی کتاب 'گرداب کی شناوری اور لذتِ صحرا نوردی'، عصمت چغتائی کی کتاب 'کاغذی ہے پیرہن'، اداجعفری کی کتاب 'جو رہی سو بے خبری رہی'، صوفیا انجم کی کتاب 'یادوں کی دستک' سعیدہ بانو کی کتاب 'ڈگر سے ہٹ کر'، بیگم انیس قدوائی کی کتاب 'غبارِ کارواں'، صالحہ عابد حسین کی کتاب 'سلسلۂ روز و شب'، ثریا حسین کی کتاب 'آب رودِ گنگا'، عذرا عباس کی کتاب ''میرا بچپن''، صغرہ مہدی کی کتاب 'حکایتِ ہستی'، شائستہ سہروردی اکرام اللہ کی کتاب 'پردے سے پارلیمنٹ تک'، تہمینہ درانی کی کتاب 'مینڈا سائیں' اور کشور ناہید کی کتاب 'بُری عورت کی کتھا' انتہائی اہمیت کی حامل خودنوشت سوانح عمریاں مانی جاتی ہیں۔

حقوقِ نسواں وحقوقِ انسانی کی سرگرم کارکن اور جدید اردو شاعرہ کشور ناہید کے نام اور سرگرمیوں سے برِصغیر ہند و پاک کے اہلِ اردو اور اربابِ حل وعقد اچھی طرح واقف ہیں۔انہوں نے معاشیات میں ایم اے کیا تھا اور معروف شاعر یوسف کامران سے ان کی شادی ہوئی تھی۔وہ ہمیشہ تانیثی خیالات و مذہبی کٹر پن کی مخالفت کے لیے سرگرمِ عمل رہی ہیں۔ترقی پسند خیالات کی حامی کشور ناہید کو ستارۂ امتیاز سے سرفراز کیا گیا تھا۔انہوں نے اپنی شاعری میں بھی مرد اساس معاشرے میں خواتین پر ڈھائے جانے والے ظلم و جبر کو اپنا موضوعِ سخن بنایا۔ان کا شعری مجموعہ ''لبِ گویا'' 1991 میں شائع ہوا۔''بے نام مسافت'' ان کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ان کی نظموں،نثری نظموں اور غزلوں پر مبنی ایک اور مجموعہ ''گلیاں، دھوپ، دروازے'' ہے۔حقوقِ نسواں کی تحریک کے علاوہ انہوں نے خواتین کے لیے کئی تعلیمی اداروں کی تشکیل میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔وہ ادبی رسالہ ''ماہِ نو'' کے مدیر کی حیثیت سے بھی کام کرتی رہی ہیں۔

کشور ناہید کی آپ بیتی 'بُری عورت کی کتھا' میں بنیادی طور پر مردوں کے ذریعہ عورتوں پر کیے جانے والے مظالم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔معاشرے میں متوسط طبقے کی خواتین کو جن اذیتوں اور دکھوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے،بُری عورت کی کتھا میں انہیں چیزوں کو کشور ناہید نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ان کی یہ خودنوشت 1994 میں ہندوستان میں اور 1997 میں پاکستان میں منظرِ عام پر آئی۔انہوں نے اپنے سوانحی حالات ،والدین اور عزیزو اقارب کا ذکر بڑے اختصار سے کیا ہے۔کشور ناہید کی والدہ بڑی صابرہ خاتون تھیں۔کشور ناہید کی والدہ اپنے شوہر یعنی کشور ناہید کے والد کی چوتھی بیوی تھیں۔ان کے والد غیر تعلیم یافتہ اور اکھڑ مزاج آدمی تھے جنہیں بچوں کی پرورش میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔انہوں نے اپنی زندگی بچوں کی تعلیم،تربیت کے لیے وقف کردی۔کشور ناہید نے گھر کے افراد سے بغاوت کرتے ہوئے اپنی مرضی سے شادی کی۔

کتاب میں نہ صرف انہوں نے اپنے والدین ،بھائی بہن اور شوہر کی عیاریوں کا ذکر کیا ہے بلکہ اپنے عہد کے تمام تر معاشرے ہی کی پولیں کھولی ہیں۔1971 کی جنگ کے دوران مشرقی پاکستان کے عوام کے اوپر جو مظالم ڈھائے گئے اور وہاں کی خواتین کے ساتھ جو درندگی اختیار کی گئی،اسے مصنفہ نے اپنی اس خودنوشت میں بڑی صداقت اور دردمندی کے ساتھ بیان کیا ہے۔انہوں نے برِصغیر میں عورتوں پر کیے جانے والی زیادتیوں ہی کا تذکرہ نہیں کیا ہے بلکہ بوسنیا،سومالیہ،گھانا اور فلسطین میں بھی خواتین پر برپا کی جانے والی بربیت کا نقشہ کھینچا ہے۔اس خودنوشت کی ابتدا میں کشور ناہید نے شعور کی رَو کی تکنیک اپناتے ہوئے ''پہلی سیڑھی'' عنوان کے تحت کچھ اس طرح سے کی ہے:

''حوا نے اپنی کہانی کسے سنائی تھی!

آدم کو۔۔۔اس نے تو مشہور کر دیا' میں اس کی پسلی سے نکلی تھی۔

خدا کو اس کی کتابوں نے تو مجھے ورغلانے والی اور مجازی خدا کو سجدہ کرنے والی بنا دیا۔

زمین کو' اس نے خود کو آنگنوں میں تقسیم کیا اور سرتابی کرنے والیوں کے بے نام بدن' اس کی کوکھ میں اترتے گئے۔

آسمان کو 'ڈرپوک' 'بزدل چیخ' اور آواز سے بچنے کو اس نے خود کو نیلاہٹوں کے نظر آنے والے فریب میں چھپالیا۔

یشودھرا نے پوچھا۔''میں تیری اور اپنی کہانی سناؤں۔''

حوا نے کہا۔''تیری آنکھ میں زخم ہو گیا تو ہوا کے گھاؤ کے تیروں کی بارش کو کیسے گن سکے گی۔

قزوین کی بیٹی زریں تاج قرۃ العین نے کہا۔میں نے تیرے جیسی زندگی کرنے کی سعی کی۔میری رسم و راہ قلندری کو ہر زمانے کے شاہ قاچار' جلاد کے حوالے کر دیتے ہیں۔

یونانی اساطیر دیوی Dance نے کہا۔''مجھے تیری سزا بھگتنے کے لیے کشتی میں بٹھا کر سمندر میں چھوڑ دیا گیا تھا اور میری کشتی نامعلوم جزیروں سے ساری عمر ٹکراتی رہی۔''میں اپنی کتھا سناؤں گی۔

سیفو اور اینوا ضما تو وا نے کہا۔''ہم سے تو ہماری شاعری کے مسودے چھینے گئے ہماری شاعری کو ملک کے لیے شرمناک سمجھا گیا۔ہمیں اپنی کہانی سنانے دو۔''

اندھی صفیہ بی بی نے کہا۔''میں نے تم سے پوچھے بنا تمہاری کہانی سنادی۔حرام کا بچہ جننے کا قصور بھی میرا تھا اور کوڑوں کی سزا بھی میرے لیے تھی۔''

حوا بلبلا اُٹھی۔''کس نے دی تھی سزا۔کیا اس عمل میں تم اکیلی تھیں بالکل اکیلی۔''

قدیم عہد ناموں میں واقعات کی تفصیل نہیں ملتی ہے۔سبق سکھانے کے لیے فیصلوں اور سزاؤں کا ذکر ملتا ہے۔''

(بُری عورت کی کتھا،کشور ناہید،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،2008 صفحہ 3)

یوسف عالمگیرین نے کشور ناہید کی شخصیت اور فن سے متعلق اپنے تبصرے میں انہیں ''دبنگ عورت'' کہا ہے۔ان کی بے باک شخصیت کے بارے میں وہ رقم طراز ہیں:

''کشور ناہید ادب میں آئیں تو ادب پر قبضہ کیے ہوئے مردوں نے انہیں خوش آمدید نہیں کہا،الٹا تنقید کے نشتر برساتے رہے۔انہوں نے عورت ہونے کے باوجود ان نشتروں کی پرواہ نہیں

کی اور اپنا سفر جاری رکھا ۔نظم کہی،نثر لکھی، تقریریں کیں، مشتعل ہوئی، اشتعال دلایا اور اب وہ سب کچھ کر دکھایا، جو اس سے پہلے کوئی عورت کرنے کی ہمت نہیں کرتی تھی۔دیگر عورتوں نے مردوں کو ان کی جگہ پر رکھنا انہی سے سیکھا۔مردوں نے بھی جواباً ان کے ساتھ کچھ کم نہیں کیا اور ان پر ایسے ایسے الزامات لگائے کہ کوئی عورت بھی دوسری عورت پر ایسے الزامات نہیں لگاتی۔''

(www.dunya.com)

محمد نوشاد عالم نے اپنے مضمون ''اردو کی باغی خواتین آپ بیتی نگار''میں عام روش سے ہٹ کر لکھنے والی اردو کی اہلِ قلم خواتین کی تحریروں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

''میں اور خاص کر مسلم متوسط طبقے کی عورتوں کو جن مشکلات اور جبر و تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کی بہترین تصویر کشی عصمت چغتائی کے بعد اگر کسی نے کی ہے تو وہ کشور ناہید ہیں ۔انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح حیات 'بُری عورت کی کتھا' میں عورتوں کے اوپر ہو رہے ظلم و ستم اور جبر و تشدد کو دلدوز انداز میں پیش کیا ہے۔یہ خود نوشت صرف کشور ناہید ہی کی نہیں بلکہ پوری عورت ذات کی سوانح حیات معلوم ہوتی ہے۔اس میں انہوں نے زمانۂ قدیم میں عورتوں پر ہونے والے مظالم، انہیں کم تر گردانتے، مردوں کا غلام بنا کر رکھنے، یہاں تک کہ انہیں جسم فروشی پر مجبور کر دینے والی پوری صورتِ حال کو پیش کیا ہے۔''

(یک موضوعی مجلہ 'اندازِ بیاں'، نئی دہلی، مئی 2016، صفحہ 274)

مرد اساس سوسائٹی میں جو برصغیر ہند و پاک میں یکساں طور پر قایم اور فعال ہے، عموماً مردوں کی عادات و اطوار کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اس کے بر عکس خواتین جو پہلے ہی سے چہار دیواری میں مقید ہیں اور مردوں کی خدمت گزاری میں ہمہ تن مصروف ہیں، انہیں کے کردار و افعال پر شک و شبہہ کیا جاتا ہے۔کشور ناہید خود نوشت ''بُری عورت کی کتھا'' میں ان تمام خواتین کی نمائندگی کرتی دکھائی دیتی ہیں:

''ہم کس قدر رشک کرتے ہیں بتوں کی طرح ٹانگیں آلتی پالتی مارے بیٹھے مسلسل تاش کے پتے پھینکتے لوگوں پر جب وہ سارا دن تاش کھیلنے کے بعد کھڑے ہوتے ہیں اپنے ہاتھ رگڑتے ہیں اپنی پینٹوں کی بیلٹ ٹھیک کرتے ہیں اپنی جیبوں میں بقایا ریزگاری کو گنتے ہیں اور گھر جا کر دیکھتے ہیں ان کی غیر حاضری میں بی بیاں نیکی اور پاکبازی پر قائم رہی ہیں۔

(بُری عورت کی کتھا، کشور ناہید، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2008 صفحہ 86)

انہوں نے اپنی خود نوشت ''بُری عورت کی کتھا'' میں طنزیہ لہجے میں جو اپنے آپ ہی کو بُری عورت قرار دیا ہے، دراصل مرد اساس معاشرے پر وار کیا ہے۔عورت جب بھی ہمارے گھر کی چہار دیواری سے باہر اپنی شناخت بنانے کی سعی کرتی ہے تو اسے بُری عورت تصور کر لیا جاتا ہے۔کشور ناہید نے اپنی داستانِ حیات سُنا کر معاشرے سے سوال کیا ہے۔گھریلو مسائل کے حل کی خاطر باہر نکلنے کا ناگزیر اقدام خواتین کے بُرے ہونے کا باعث ہے تو معاشرہ وہ تمام ذمے داریاں خود ہی کیوں نہیں نبھاتا ہے۔کشور ناہید نے اس کتاب میں اپنے بچپن ، جوانی، شادی، ملازمت اور زندگی کے دیگر ادوار کی تصویریں پیش کی ہیں۔اس میں انہوں نے چند خطوط اور اخباروں میں شائع شدہ مضامین کے علاوہ اپنے نکاح کا خطبہ بھی شامل کیا ہے۔کشور ناہید نے بڑی حوصلہ مندی کے ساتھ مرد اساس سوسائیٹی کا مقابلہ کیا ہے۔ انہیں آزاد خیال عورت مانتے ہوئے ان پر تہمتیں لگائی گئیں اور یہاں تک کہ انہیں 'دبنگ عورت' کا لقب دیا گیا۔تمام رکاوٹوں کے باوجود کشور ناہید نے سماج سے اپنی جنگ خود، تنِ تنہا لڑی اور ادب کے ہر مورچے پر انہوں نے کامیابی حاصل کی ۔یہ خود نوشت نہ صرف کشور ناہید کی زندگی کا احاطہ کرتی ہے بلکہ برِصغیر ہند و پاک کی سیاسی اور سماجی صورتِ حال کی کہانی بھی پیش کرتی ہے۔

کشور ناہید کی آپ بیتی ''بُری عورت کی کتھا''، امرتا پریتم کی آپ بیتی ''رسیدی ٹکٹ''، سعیدہ احمد کی آپ بیتی ''ڈگر سے ہٹ کر''، عصمت چغتائی کی آپ بیتی ''کاغذی ہے پیرہن'' اور نفیس بانو شمع کی آپ بیتی ''جنت سے نکالی ہوئی حوا'' میں جن نسوانی کرداروں کو پیش کیا ہے وہ سب مظلوم و مجبور اور زمانے کی ستم ظریفیوں کا شکار ہیں۔ان کی زندگیاں برباد ہو چکی ہیں اور ان میں خواہشاتِ زندگی ختم ہو چکی ہیں۔ اس خود نوشت میں رابعہ، شاہجہاں ، نایاب ، افروز ، رشیدہ خاں اور ثروت بیگم جیسے سبھی کردار مردوں کے ظلم و ستم کا شکار ہیں ۔ان کی خود نوشت پدرسری نظام میں صنفِ نازک کے ساتھ پیش آنے والے جبر و تشدد سے پیدا شدہ درد و الم کی حقیقی کہانیاں موجود ہیں۔

کتاب ''جنت سے نکالی ہوئی حوّا'' نفیس بانو شمع کی زندگی کے احساسات، مشاہدات اور تجربات پر مبنی ایک دلچسپ سرگزشت ہے، جس کا بنیادی موضوع معاشرے میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیاں اور استحصال ہے ۔اس سوانح کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ اردو کے معتبر ناقدین و محققین نے اس کے مقام و مرتبے پر اپنی آرا درج کی ہیں ۔ان نامور ادیبوں میں ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر ابو الفیض سحرؔ، پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی، ڈاکٹر وہاج الدین علوی، ڈاکٹر مسعود ہاشمی کے علاوہ فصیح اکمل، ڈاکٹر تابش مہدی، حقانی القاسمی اور ڈاکٹر نوشاد عالم وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔مگر ضخیم رسالے 'دستاویز' کے آپ بیتی نمبر میں محترمہ نفیس بانو شمع کی اس کاوش کو ''بے رنگ

اور غیر دلچسپ'' کہہ کر قابلِ اعتناء ہی نہیں مانا ہے اور اس طرح اس میں ان کی اس تصنیف کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا ہے جو زمانے نے بحیثیت خاتون خود مصنفہ کے ساتھ روا رکھا تھا لیکن اس کے برعکس ''اندازِ بیاں'' کے خواتین کی خود نوشت نگاری پر خصوصی شمارے میں نفیس بانو شمع کی اس آپ بیتی کی خاطر خواہ پذیرائی کی گئی ہے اور نسائی ادب میں اس آپ بیتی کو وہ مقام دلانے کی سعی کی گئی ہے ، جس کی وہ مستحق ہے۔مجلہ ''اندازِ بیاں'' میں ڈاکٹر محمد نوشاد عالم نے اپنے مضمون ''اردو کی باغی خواتین آپ بیتی نگار'' میں عصمت چغتائی کی آپ بیتی 'کاغذی ہے پیراہن'، کشور ناہید کی آپ بیتی 'بُری عورت کی کتھا' اور نفیس بانو کی آپ بیتی 'جنت سے نکالی ہوئی حوّا' کا ادب وفن اور معاشرتی نقطۂ نظر سے تجزیہ پیش کیا ہے ۔ اس سوانح حیات کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''نفیس بانو شمع کا بیانیہ فطری اور حقیقت سے قریب ہے ۔اسلوب سادہ ، پُر اثر اندازِ بیان ،تحریر صاف اور دلنشین ہے ۔خارجی اور داخلی کیفیات کا اظہار خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔عشقِ مجازی سے لیکر عشقِ حقیقی تک کے اسرار و رموز ،تصوف کی اصطلاحیں ،قرآن و حدیث کے حوالے اور واقعے کے اختتام پر ایک کاٹ دار جملہ ،عیاش اور بدچلن مردوں کی بد اعمالیوں سے ابھرتی سسکیاں ،عورتوں کی کراہیں اور دلگداز چیخیں وغیرہ اس خودنوشت میں ہمیں سننے کو ملتی ہیں۔یہ کتاب اپنی بیباکی ،حق گوئی اور منفرد طرزِ نگارش کے ساتھ عورتوں کی بیداری اور حقوق کی بازیابی کا پیغام ہے۔یہ ایک کامیاب خودنوشت سوانح حیات ہے۔''

(یک موضوعی مجلہ 'اندازِ بیاں' مرتبہ حقانی القاسمی، از مضمون 'اردو کی باغی خواتین آپ بیتی نگار' مصنفہ ڈاکٹر محمد نوشاد عالم ،مطبوعہ امکانات پبلی کیشنز، دہلی، 2016 صفحہ 280)

اسی مجلہ میں اپنے مبسوط مضمون ''جنوں زاویہ'' میں حقانی القاسمی نے بھی نفیس بانو شمع کی آپ بیتی 'جنت سے نکالی ہوئی حوّا' پر اپنے تاثرات ان الفاظ میں پیش کیے ہیں:

'جنت سے نکال ہوئی حوّا' میں جہاں ایک طرف سماجی خبر نامہ ہے ،وہیں ادبی منظر نامہ بھی ہے۔ادب اور سماج کے گہرے ارتباط کو نفیس بانو شمع نے بڑی ہی فنی چابک دستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔''

('اندازِ بیاں' مرتبہ حقانی القاسمی ،از مضمون 'جنوں زاویہ' مصنفہ حقانی القاسمی، مطبوعہ امکانات پبلی کیشنز، دہلی، 2016 صفحہ 18)

نفیس بانو شمع اردو کی افسانہ نگار بھی ہیں اور شاعرہ بھی۔موصوفہ کے تصنیف کردہ ناول ''سماج'' کی بھی اردو حلقوں میں پذیرائی ہوئی ہے ۔ان کی آپ بیتی 'جنت سے نکالی ہوئی حوّا' 1998 میں منظرِ عام پر آئی۔انہوں نے حالات و واقعات کو پیش کرتے وقت بڑی صاف گوئی اختیار کی ہے ۔انہوں نے کسی قسم کی جھجک یا خوف کو اپنے پر طاری نہیں ہونے دیا ہے۔ مصنفہ نے اپنی زندگی کے تجربات اور واقعات کو عورت ذات سے مکمل طور پر ہم آہنگ کر لیا ہے، جسے ایک اچھی خو دنوشت کی خصوصیت قرار دیا جا سکتا ہے۔نفیس بانو شمع نے اپنی اس خودنوشت کو تحریر کرنے سے پہلے چند دستیاب سوانح عمریوں کا بغور مطالعہ بھی کیا تھا اور اس فن کی تکنیک اور لوازمات کو شعوری طور پر سمجھنے، پرکھنے اور برتنے کی سعی بھی کی تھی۔نفیس بانو شمع اپنی اس خودنوشت کے ایک باب بعنوان 'اور قلم مجبور میرا' میں اپنے فنکار بننے کے اسباب و عوامل کی خود احتسابی کرتی دکھائی دیتی ہیں ۔وہ لکھتی ہیں کہ جب وہ شعور کی منزل پر پہنچیں تو طبیعت از خود شعر و شاعری اور کہانیوں کے مطالعہ کی طرف مائل ہوگئی۔وہ بچپن ہی سے حساس طبع رہی تھیں۔اس لیے چھوٹے چھوٹے واقعات ان کے ذہن و دل پر نقش ہو جایا کرتے تھے۔اس باب میں نفیس بانو شمع نے اپنے جن ہمعصر افسانہ نگاروں اور شاعرات کی زندگی اور فن سے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں ،ان کے نام یہ ہیں قرۃ العین حیدر، امرتا پریتم، واجدہ تبسم، بشریٰ رحمٰن ،ادا جعفری، پروین شاکر اور سارا شگفتہ۔کتاب کے ایک اور باب ''پاسبانِ ادب'' میں وہ ہمعصر ادبی دنیا کے جن لوگوں سے اپنے تعلقات کا بے ساختہ ذکر کرتی ہیں ان میں جناب بیکل اتساہی، کنور مہیندر سنگھ بیدی سحرؔ، ندا فاضلی، افتخار امام صدیقی، کیف بھوپالی، تابش مہدی، فصیح اکمل ، رفعت سروش، شاہد پرویز، پروفیسر عنوان چشتی، حاجی انیس دہلوی اور جاوید قمر شامل ہیں۔

نفیس بانو شمع کی یہ خودنوشت 1947ء کے بعد کی نسل کی ایک ایسی خاتون کی داستان ہے جو اتر پردیش کے ایک آسودہ و متمول زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئی ۔ان کے دادا دادی نے ان کی بڑے لاڑ و پیار کے ساتھ پرورش کی تھی ۔لیکن دادا دادی کے انتقال کے بعد انہیں بڑے نا مساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا ۔ان کے والد ایک فوجی افسر تھے ۔ان کی والدہ معمولی پڑھی لکھی گھریلو خاتون تھیں۔ان کے تین بچے تھے۔نفیس بانو چار برس کی تھیں اور سب سے بڑی تھیں۔ان کے بعد ایک چھوٹا بھائی اور اس سے چھوٹی بہن بھی تھی۔والد گاؤں کی ایک دوسری لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو گئے اور خاندان کے افراد کے نہ چاہتے ہوئے بھی انہوں نے دوسری شادی کر لی تھی۔لہٰذا ان کی والدہ اپنے تینوں بچوں سمیت اپنے نانہال میں منتقل ہوگئیں جو اب ان کا مستقل ٹھکانہ بن گیا۔نانا نانی اور ماموں نے بڑی شفقت کے ساتھ ان کا خیال رکھا ۔لیکن باپ کی کمی ایک ناسور کی طرح نفیس بانو شمع کے دل و دماغ کو متاثر کرتی رہی ۔وہ اپنے بچپن کے واقعات بڑے دردانگیز انداز میں بیان کرتی ہیں ۔یہ آپ بیتی سچی بھی ہے اور انتہائی دلچسپ بھی ۔ان کا بیانیہ بڑا ہی پُر تاثیر ہے ۔مثلاً اپنے بچپن کے ایک

بڑے حادثے کا منظر وہ ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں:

''ایک بزرگ کے سالانہ عرس میں شرکت کے لیے ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔ کسی نے چین کھینچ دی۔ ٹرین کی رفتار کم ہوتا دیکھ کر میری نانی جو دیہات کی سیدھی سادی، سادہ لوح خاتون تھیں، سمجھیں کہ اسٹیشن آ گیا ہے۔ وہ مجھے گود میں لیکر اترنے لگیں۔ دفعتاً ان کا پیر پھسلا۔ میں ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر ٹرین کے نیچے جا پڑی۔ لوگوں نے سمجھا کہ میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر چکی ہوں گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ جب ٹرین کی حرکت ختم ہوئی تو ایک ہجوم نے دیکھا کہ ٹرین کے پہیئے سے میری گردن کا فاصلہ چند انچوں کا تھا۔ قدرت کے اس کرشمے پر سب محوِ حیرت تھے۔ مگر یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ چند انچوں پر کھڑی موت نے لوحِ محفوظ پر دیکھ لیا تھا کہ میری موت قسطوں میں لکھی ہوئی ہے۔ میں بڑی سخت جان ہوں، ایک بار کی موت میرے لیے کافی نہ ہوگی۔'' نفیس بانو شمع پر اس حادثے کا بڑا گہرا اثر ہوا تھا۔ وہ اسی واقعے سے متعلق مزید لکھتی ہیں۔ ''آج بھی جب کوئی ٹرین قریب سے گزرتی ہے تو مجھ سے چند فاصلے پر کھڑی موت مسکرا کر میرا چہرہ دیکھتی ہے۔''

(جنت سے نکالی ہوئی حوّا، آپ بیتی، مصنفہ نفیس بانو شمع، آبشار پبلی کیشنز، نئی دہلی، 1998 صفحہ 50-51)

نفیس بانو شمع کے پاس افسانوی ادب لکھنے کا شعور ہے۔ ان کی زندگی خواتین کی تکلیفوں، زیادتیوں اور مصیبتوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان کا اندازِ بیان خوبصورت اور موثر ہے۔ اس خودنوشت میں مصنفہ مردوں کے ظلم وستم اور عورتوں کی لاچاری و بے بسی کی کیفیت کو شدت اور دردمندی کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ مرد کے ذریعہ ستائی گئی عورتوں کو در بدر کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔ ان کے احساسات و جذبات کے مجروح ہونے کا درد نفیس بانو شمع کی اس خودنوشت میں بہت نمایاں ہے۔ مصنفہ نے زندگی کے واقعات، حالات اور تاثرات کو پچاس ابواب میں تقسیم کیا ہے اور پھر بڑی باریکی اور تمام تر توجہ کے ساتھ واقعات و مناظر کے تانے بانے بُنے ہیں۔

اس خودنوشت کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مصنفہ اپنی ازدواجی زندگی سے بڑی نا مطمئن تھیں۔ وہ اپنے شوہر کی غلط کاریوں، معاشقوں اور خود مصنفہ کے تئیں ان کی بے اعتنائی کا گلہ کرتی ہیں۔ اپنی بچی کی تولید کے بعد انہیں یہ توقع ہوئی تھی کہ ان کے شوہر باپ بننے کے بعد بے راہ روی سے باز آ جائیں گے اور راہِ راست کی زندگی اپنا لیں گے لیکن ایسا ہوا نہیں۔ وہ بائیس سال کی عمر میں تین بچوں کی ماں بن چکی تھیں۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ پر ان کی زندگی نا آسودگی اور بے اطمینانی کی داستان بن کر رہ گئی تھی۔ 1976 میں ان کی زندگی میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ جب وہ ضلع رامپور کے ایک گاؤں بھینسوڑی شریف کے سجادہ نشین صوفی لیاقت حسین (مُنّے میاں) سے رابطے میں آئیں، باقاعدہ ان کے ہاتھ بیعت لی اور اس طرح سلسلۂ چشتیہ ابوالعلائی میں داخل ہو گئیں۔ بقول مصنفہ تب تک وہ پیری مریدی سے واقف نہیں تھیں۔ ان کے مرشد کی ہدایت کے مطابق وہ کثرت سے درود شریف پڑھنے لگیں، جس سے ان کے دل کے تاریک گوشے منور ہو گئے۔ ہدایات کے مطابق کشف المحجوب، سیرتِ فخر العارفین، احیاء العلوم، کیمیائے سعادت اور شیخ سعدی کی گلستاں و بوستاں کے مطالعے اور فضل سے بقول مصنفہ تمام زخموں کا مداوہ ہو گیا۔ نفیس بانو شمع لکھتی ہیں کہ اب مجھے عشق تھا اس پوری کائنات سے، نیلے آسمان پر تیرتے اپنے پر پھیلائے چہچہاتے آزاد پرندوں سے، ٹھہرے ہوئے رات کے سناٹوں سے، پگھلتی ہوئی سیال چاندنی سے، سمندر کے سینے میں بند بپھرے ہوئے منہ زور طوفانوں سے، اونچی پہاڑیوں کی بلندی سے گرتے، گیت گاتے آبشاروں کی شوخی سے، ننھے منے ستاروں کے دل میں دھڑکتی خاموشی سے اور صبح کی پہلی دستک پر کھلنے والے شاداب پھولوں سے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر شعبۂ اردو ادب کے پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی رقم طراز ہیں:

''یہ خودنوشت سوانح عمری ''موجودہ دور میں women empowerment کی تحریک کو بھی تقویت پہنچاتی ہے۔ عورت خالقِ کائنات کی صناعی کا ایک عظیم مظہر اور انسانی زندگی میں توازن، اعتدال اور لا زوال مسرتوں کا سر چشمہ ہے۔ جسکے گدلا ہو جانے کا تصور اندوہ ناک ہے۔ نفیس بانو شمع کی کہانی میں ان کے شعلہ بار نفس کی آنچ بہت تیز ہے۔ لیکن یہی آگ خود ان کی روحانی بالیدگی اور ترفع کا بھی واحد وسیلہ ہے جس کے سبب ایک بظاہر تکلیف دہ تجربہ قاری کی اپنی نجات کا بھی ضامن بن جاتا ہے۔''

(جنت سے نکالی ہوئی حوّا، آپ بیتی، مصنفہ نفیس بانو شمع، آبشار پبلی کیشنز، نئی دہلی، 1998 صفحہ 18-19)

جو نسوانی کردار اس خودنوشت کے توسط سے قارئین کے دل و دماغ کو جھنجھوڑتے ہیں ان میں شاہجہاں، رابعہ آپا، جولی، زیتون، راج کماری، نایاب، افروز، رشیدہ خان، نکہت اور ثروت بیگم وغیرہ خصوصی اہمیت کی حامل ہیں اور خواتین کے کرب کی علامت بن کر ابھرے ہیں۔ ڈاکٹر مسعود ہاشمی اس کتاب کے ضمن میں فن اور تکنیک کے نقطۂ نظر سے بجا طور پر لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ نفیس بانو شمع نے 'جنت سے نکالی ہوئی حوّا' کی شکل میں اردو میں سوانح نگاری کو ایک بالکل نئی نہج دی ہے۔ ایک ایسی نہج، جو منفرد ہی نہیں ہے، تمام تر تخلیقی بھی ہے

،یعنی ایک ایسی تحریر جو اس حد تک سرور آگیں ہے کہ قاری کو دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر کر دیتی ہے۔یہی شمع کے قلم کا اور فن کا کمال ہے۔''

(جنت سے نکالی ہوئی حوّا ،آپ بیتی،مصنفہ نفیس بانو شمع ،آبشار پبلی کیشنز ،نئی دہلی، 1998 صفحہ 24)

خودنوشت سوانح عمری ''جنت سے نکالی ہوئی حوا''میں نفیس بانو شمع بے جھجک اس بات کا اعتراف کرتی ہیں کہ ان کا عشق ،عشقِ حقیقی نہیں تھا۔انہیں زندگی جینے کے لیے کتنے ہی امتحانات سے گزرنا پڑا ۔جب وہ صوفیانہ ڈگر پر چل نکلیں تو آستانۂ حضرتِ محبوبِ الٰہی پر بھی پہنچیں جسے انہوں نے بڑا خوبصورت عنوان دیا کہ،''شہرِ جاناں سے چلی اور تیرے در پر پہونچی'' دہلی میں کچھ دن راہبہ کے طور پر گزارنے کے بعد درگاہِ حضرتِ نظام الدین اولیاء پر پناہ گزیں ہو گئیں،جس کا اظہار انہوں نے اس شعر کی مثال دے کر کیا ہے کہ:

زندگی غم کی کڑی دھوپ میں دم لینے کو
آپ کے سایۂ دیوار تک آ پہنچی ہے

اس باب میں انہوں نے دہلی کے اس آستانے کے تجربات ومشاہدات اور انکشافات پیش کیے ہیں۔ جب بچوں کی یاد سے بچین ہوئیں تو دوبارہ ممبئی میں اپنے گھر جا پہنچی ۔شوہر نے انکا احوال جاننے کے بجائے طعنہ دیا،''کیا دنیا کے تمام دروازے تمہارے لیے بند ہو چکے ہیں۔کب تک میرے گھر سے چمٹی رہو گی؟''اس پر نفیس بانو شمع کا جواب یہ تھا''اب انہیں کیا جواب دیتی کہ یہ بچے میرے پاؤں کی بیڑیاں بن گئے ہیں اور انہیں کی محبت مجھے دوبارہ کھینچ لائی ہے ورنہ اس جہنم میں کون رہ سکتا ہے جہاں صرف نفرت ،ذلت،سیاست ،مصلحت پسندی اور خودغرضی کی گھٹن ہو۔''

ڈاکٹر وہاج الدین علوی اس خودنوشت کا فنی نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس میں بیانیہ کی تکنیک اور افسانوی انداز میں اپنی زندگی کی کہانی دہرائی گئی ہے ۔واقعات کی صداقت کے پیشِ نظر مصنفہ نے مشرقی روایات کا گلا نہیں گھوٹا ورنہ بہت سے مواقع ایسے آئے تھے جہاں وہ الفاظ کے ذریعہ لذتیت کی کیفیت پیدا کر سکتی تھیں۔اس خودنوشت میں متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی عکاسی کی گئی ہے۔خودنوشت نگار نے شعوری طور ران طبقات کی کمزوریوں،محرومیوں،ناکامیوں اور ان سے پیدا ہونے والی نفسیات کو اپنی ذات کے حوالے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔''

(جنت سے نکالی ہوئی حوّا ،آپ بیتی،مصنفہ نفیس بانو شمع ،آبشار پبلی کیشنز ،نئی دہلی، 1998 صفحہ 21)

مرد ہر صورت میں چاہے وہ باپ ہو ،بیٹا ہو،شوہر ہو،محبوب ہو یا دوست ہو خواتین کا استحصال کر رہا ہوتا ہے۔اسی نقطۂ نظر کو نفیس بانو شمع نے اپنی سوانح حیات میں اجاگر کرنے کی کہیں شعوری طور پر اور کہیں لاشعوری انداز میں سعی کی ہے۔اپنی داستانِ حیات بیان کرنے میں نفیس بانو شمع نے سامعین سے کوئی بات نہیں چھپائی ہے۔اسی لیے یہاں زندگی کی تڑپ اور معاشرے کے دل کی دھڑکن واضح طور پر سنائی دیتی ہے اور اس طرح یہ کتاب مصنفہ کی زندہ تصویر پیش کرتی ہے اور خواتین کے قلم سے لکھی ہوئی خودنوشت سوانح عمریوں میں اپنی ایک منفرد پہچان بنانے کے ساتھ ساتھ خواتین میں بیداری کا جذبہ اور اپنے حقوق کی بازیابی کی امنگ پیدا کرتی ہے۔

حوالہ جاتی کتب:

۱۔ ڈاکٹر صبیحہ انور، اردو میں خود نوشت سوانح حیات،نامی پریس لکھنؤ،1982

۲۔ وہاج الدین علوی،اردو میں خودنوشت سوانح: فن وتجزیہ،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،دہلی،1989

۳۔ حقانی القاسمی، یک موضوعی مجلہ'اندازِ بیاں'، امکانات پبلی کیشنز،دہلی،2016

۴۔ رشیدہ عیاں، میری کہانی ، اشارات ،کراچی،2004

۵۔ کشور ناہید، بُری عورت کی کتھا،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،2008

۶۔ نفیس بانو شمع، جنت سے نکالی ہوئی حوّا،آبشار پبلی کیشنز،نئی دہلی،1998

❑❑❑

خصوصی نمبر کی اشاعت

ماہنامہ 'نیا دور' عنقریب گورکھپور کے ادبی و تہذیبی آثار پر ایک خصوصی نمبر کی اشاعت کرنے جارہا ہے لہٰذا اہل قلم حضرات گورکھپور کے ادبی حلقوں سے وابستہ ادبا وشعرا و ناقدین کی تخلیقات پر اپنے قلمی نگارشات ہمیں ارسال کر سکتے ہیں۔

اس خصوصی نمبر سے متعلق آپ کے مضامین ایک تاریخی وادبی دستاویز کی تدوین میں خاص اہمیت کے حامل ہوں گے۔جس کے لئے ماہنامہ 'نیا دور' آپ کا شکر گزار ہوگا۔

ایڈیٹر
ماہنامہ 'نیا دور'

پروفیسر یوسف سرمست کی ادبی خدمات

نظیر احمد گنائی

ریسرچ اسکالر

دہلی یونیورسٹی

دہلی

رابطہ: 7889779687

پروفیسر یوسف سرمست اردو ادب کا ایک بڑا نام ہے۔وہ بیک وقت مضمون نگار، محقق اور نقاد کی حیثیت سے اردو حلقوں میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ان کا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے۔دکن نے ہر دور میں اردو ادب کی خدمت کی ہے۔بڑے بڑے شعراء، تنقید نگار، محقق اور مورخ پیدا کئے ہیں۔نثر ہو یا نظم، تحقیق ہو یا تنقید، پروفیسر یوسف سرمست نے تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کی شہرت نہ صرف حیدرآباد میں ہے بلکہ اردو تنقید نگاری میں انہیں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

یوسف سرمست ۲۸ر دسمبر ۱۹۳۶ء مطابق ۱۵ر شوال ۱۳۵۵ھ بروز پیر بمقام بشیر باغ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔تمکین سرمست (والد) اور بد رالنساء (والدہ) کی صرف تین اولادیں تھیں جن میں یوسف سرمست کا نمبر دوسرا تھا۔یوسف سرمست کا اصل نام یوسف شریف الدین ہے۔ان کا نام درگاہِ یوسفین (حضرت یوسفؒ اور شریف صاحبؒ) کے ناموں پر رکھا۔

یوسف شریف الدین کی ابتدائی تعلیم ان کی والدہ محترمہ کی زیر نگرانی گھر پر ہوئی۔قرآن شریف اور اردو کا بولتا قاعدہ انہوں نے اپنی ماں ہی سے پڑھا۔اس کے بعد مغل پورہ، ہری باؤلی محلے میں ''رفاہ عام مڈل اسکول'' میں انہیں ابتدائی تعلیم کے لیے داخل کروایا گیا۔یہیں سے پانچویں جماعت کا امتحان پاس کیا، چھٹی اور ساتویں جماعت کے لیے شاہ علی بنڈہ مڈل اسکول، یہاں انہوں نے جی جان محنت کر کے ساتویں کا بورڈ امتحان اچھے نمبرات سے پاس کیا۔پھر ''سٹی کالج'' میں داخلہ کرایا گیا۔یہاں ڈگری وانٹرمیڈیٹ کے ساتھ ساتھ ہائی اسکول کی تعلیم کا نظام بھی تھا۔یوسف شریف الدین نے سٹی ہائی اسکول، سٹی کالج سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، انٹرمیڈیٹ کی تعلیم بھی آرٹس مضامین میں پاس کی۔اس کے بعد آرٹس کالج جامعہ عثمانیہ میں ،اردو، معاشیات اور سماجیات مضامین منتخب کئے۔۱۹۵۶ء میں درجہ دوم میں گریجویشن امتیازی نمبرات سے پاس کی۔بی۔اے میں پروفیسر عبدالقادر سروری، جناب سید محمد، ڈاکٹر حفیظ قتیل اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ جیسے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔

عثمانیہ یونی ورسٹی میں ایم۔اے اردو کے لیے ۱۹۵۸ء میں داخلہ لیا۔انہوں نے ایم۔اے اوّل درجے میں پاس کیا۔۱۹۶۰ء میں یونی ورسٹی نے ڈگری عطا کی اور اس کے بعد پی ایچ۔ڈی میں داخلہ لیا۔

پی ایچ۔ڈی میں پروفیسر عبدالقادر سروری ان کے نگراں مقرر ہوئے ۔ ان کا تحقیقی مقالہ بہ عنوان ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' مقرر ہوا۔ ۱۹۶۶ء میں انہوں نے اپنا ضخیم مقالہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے زیر نگراں جمع کیا۔ اس کے بعد ۱۹۶۸ء میں انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی گئی۔

یوسف سرمست نے ایم۔اے کی تعلیم کے دوران مضامین لکھنے شروع کئے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا پہلا ادبی مضمون ''میر کی شاعری اور شخصیت'' لکھا جو رسالہ ''نگار'' میں شائع ہوا۔ انہوں نے دوسرا مضمون ''مصحفی کی شاعری'' کے عنوان سے لکھا جو ۱۹۶۰ء میں رسالہ ''نگار'' میں شائع ہوا۔ اس طرح سے وہ یوسف شریف الدین سے یوسف سرمست بن گئے۔ ان کے مضامین رسالہ ''صبا'' اور ''نوائے ادب'' میں شائع ہوا کرتے تھے۔ ادبی ذوق، تحقیق کا جذبہ اور تحریری صلاحیتیں ان میں ابتدا ہی سے تھی۔ انہیں ادب سے خاص دلچسپی تھی اور ادب سے دلچسپی تو ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ گھر کا ماحول ادبی تھا، گھر پر کئی رسالے آتے تھے جن کا وہ مطالعہ کرتے تھے۔ جیسے ''ارباب'' بچوں کے رسالے ''پھول'' (دہلی) اور ''غنچہ'' (دہلی) وغیرہ۔ ان کی بہن بچپن میں انہیں ناول پڑھ کر سناتیں تھیں۔ مڈل اسکول ہی میں انہوں نے ''الف لیلیٰ'' کا مطالعہ کرلیا تھا۔ سٹی کالج لائبریری سے ساحر لدھیانوی کا پہلا مجموعہ ''تلخیاں'' پڑھ کر وہ لطف اندوز ہوتے تھے۔ انہوں نے آٹھویں جماعت میں ایک مضمون لکھا تھا جسے پڑھ کر استاد نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔ یوسف سرمست اس مضمون کے تعلق سے اپنے انٹرویو میں فرماتے ہیں:

نیاز فتح پوری رسالہ ''نگار'' پاکستان نمبر نکالتے تھے۔ اس وقت اس میں ہندوستان کے ابتدائی مسلم حکمرانوں کی تفصیل آرہی تھی۔ اتفاق سے ہمارے استاد ''سید علی برتر'' نے خاندان غلامان کے تعلق سے کوئی عنوان دیا تھا جس پر مضمون تیار کرنا تھا۔ میں نے ''نگار'' کے شمارے سے استفادہ کرکے پرچہ تیار کیا اور داخل کردیا جسے پڑھ کر استاد متعجب ہوئے کیوں کہ اس میں ایسی ایسی معلومات تھیں جو خود استاد کے بھی علم میں نہیں تھیں چنانچہ انہوں نے مجھ سے اس کی تفصیل جانی کہ مواد کہاں سے ملا وغیرہ اور تفصیل جان کر بہت خوش ہوئے۔ بہت تعریف کی اچھے نمبرات دیئے۔''[۱]

اس مضمون کے علاوہ وہ سٹی کالج کا ایک میگزین نکلتا تھا ''الموسیٰ'' کے نام سے۔ آٹھویں جماعت میں انہوں نے اس میں ایک مضمون ''بوعلی سینا'' پر لکھا تھا۔ اس کے علاوہ حیدرآباد کے بچوں کے لیے ایک رسالہ ''تارے'' کے عنوان سے نکلتا تھا۔ جس کے ایڈیٹر مسلم ضیائی تھے۔ انہوں نے بعض لطیفے لکھے تھے جو اس میں شائع ہوچکے ہیں۔ جب کہ وہ ابھی مڈل بھی پاس نہیں ہوئے تھے۔ ایم اے کے امتحان کی تیاری وہ بالکل مختلف طریقے سے کرتے تھے۔ شعرا کے تعلق سے مختلف کتابیں پڑھ کر وہ خود ہی مضمون تیار کرلیتے تھے۔ اس طرح ایم اے کے زمانے میں میر تقی میرؔ پر ایک مضمون انہوں نے تیار کیا تھا۔ ''میر کی شاعری اور شخصیت'' کے عنوان سے تھا۔ اس مضمون کو چپکے سے انہوں نے جو کسی کو بتائے بغیر ایک اعلیٰ درجہ کے عنوان سے تھا ادبی رسالہ ''نگار'' (لکھنو) کو شائع کرنے کے لیے بھیج دیا اور ایڈیٹر علامہ نیاز فتح پوری جو خود کئی کتابوں کے مصنف تھے کے نام ایک خط لکھا کہ

''میں نہیں جانتا کہ یہ مضمون کیا ہے۔ کیسا لکھا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی رہبری چاہتا ہوں۔''

جواب میں علامہ نے مضمون پر کوئی تبصرہ نہیں کیا صرف اتنا لکھا کہ آپ کا مضمون آئندہ اپریل کو نگار (لکھنو) میں شائع ہورہا ہے۔ میرؔ پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ آپ ایسے شاعر کو لیجئے جو باوجود جلیل القدر ہونے کے گمنامی میں پڑا ہوا ہے۔ اس مضمون کے بارے میں انہوں نے اپنے انٹرویو میں تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ:

''میں نے مصحفیؔ پر مضمون تیار کرلیا اور وہ بھی ''نگار'' (لکھنو) کو روانہ کردیا۔ اتفاق سے اس مضمون پر اپنا نام لکھنا بھول گیا۔ اس زمانے میں ایڈیٹر کے نام خط الگ لکھا جاتا تھا اور مضمون الگ۔ اب مضمون پر تو نام نہیں ہے۔ چنانچہ ایڈیٹر نے ایک نام ''ایک پروفیسر'' لکھا (چونکہ پروفیسر بھولنے کے لیے شہرت رکھتے ہیں شاید اسی مناسبت سے ایڈیٹر نے پروفیسر لکھ دیا) لیکن میں بڑا خوش ہوگیا کہ طالب علمی کے زمانے میں ہی گویا علامہ کے قلم سے پروفیسر لکھ دیا گیا بلکہ بنا دیا گیا۔''(۲)

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اوائل عمری ہی سے تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھا کرتے تھے اور انہیں بڑے بڑے اساتذہ سے داد بھی ملتی۔ غرض اس طرح ایم اے کے امتحان کی تیاری کے سلسلے میں انہوں نے جتنے مضامین تیار کئے ان میں سے بیشتر مضامین کو بعد میں یکجا کرکے ''عرفانِ نظر'' کے نام سے کتابی شکل دے دی۔

ایک ہونہار لائق وفائق طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ ادب سے غیر معمولی شغف کی وجہ سے وہ اپنے اساتذہ سے بے حد قریب تھے۔ اساتذہ کی ہمت افزائی نے تحریری صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ ایک مضمون کے تعلق سے حفیظ قتیل نے ان کی ستائش کرتے ہوئے انہیں کہا تھا:

''لوگ سر پٹکتے ہیں لیکن لکھنا نہیں آتا۔ تمہاری تحریر میں بہت گہرائی ہے۔ بہت اچھا

مضمون لکھا۔‘‘(۳)

پروفیسر عبدالقادر سروری انہیں پسند کرتے تھے اور ان کی ادبی صلاحیتوں سے متاثر تھے۔ چنانچہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’سروری صاحب مجھ سے ادبی کام لیا کرتے تھے۔ میرے گھر آتے اور مجھے اپنی کار میں بٹھا کر جہاں جانا ہوتا لے جاتے۔ خاص طور پر لائبریری میں کچھ بھی کام ہوتا جیسے مضامین کی نقل کرنا یا کچھ بھی تو مجھ سے کرواتے۔ اس طرح مجھے بھی مختلف لائبریریوں کو دیکھنے اور مختلف کتابوں کے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔‘‘(۴)

اس طرح اردو ادب سے ان کا شغف بڑھتا گیا اور انہوں نے یکے بعد دیگرے کئی کتابیں اور مضامین لکھے۔ ان کی تصانیف کی فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے:

۱۔ پریم چند کی ناول نگاری، دسمبر ۱۹۷۶ء
۲۔ عرفان نظر (مضامین کا مجموعہ)، دسمبر ۱۹۷۷ء
۳۔ ادب کی ماہیت، منصب اور تعریف، اگست ۱۹۸۳ء
۴۔ ادب نقد حیات (تحقیقی، تنقیدی مضامین کا مجموعہ)، دسمبر ۱۹۹۳ء
۵۔ بیسویں صدی میں اردو ناول، مارچ ۱۹۹۵ء
۶۔ تحقیق وتنقید، مارچ ۱۹۹۹ء باراوّل
۷۔ نظری اور عملی تنقید، دسمبر ۲۰۰۲ء باراوّل
۸۔ دکنی ادب کی مختصر تاریخ، دسمبر ۲۰۰۶ء
۹۔ ادب کا نوبل انعام ادبی یا سیاسی اور دوسرے مضامین، دسمبر ۲۰۱۰ء
۱۰۔ اردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر کی انفرادیت، ۲۰۱۲ء

ان تصانیف کے علاوہ تقریباً سو سے زائد تحقیقی وتنقیدی مضامین ہندوستان اور بیرونی ممالک کے مشہور ومعروف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

سمیناروں میں شرکت

یوسف سرمست تقریباً چوبیس (۲۴) کل ہند کانفرنس وسمینار اور نو (۹) بین الاقوامی سمیناروں میں شرکت کر چکے ہیں اور مختلف موضوعات پر مضامین بھی پیش کر چکے ہیں۔ ان کی فہرست ذیل میں درج ہے:

۱۔ اساتذہ کی کل ہند کانفرنس، کشمیر یونیورسٹی، ۱۹۶۷ء
۲۔ اساتذہ کی کل ہند کانفرنس، لکھنو یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء
۳۔ اساتذہ کی کل ہند کانفرنس، مرٹھواڑہ یونیورسٹی، ۱۹۷۳ء
۴۔ غالبؔ پر کل ہند سمینار، حیدرآباد، ۱۹۷۴ء

> وہ اوائل عمری ہی سے تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھا کرتے تھے اور انہیں بڑے بڑے اساتذہ سے داد بھی ملتی۔ غرض اس طرح ایم اے کے امتحان کی تیاری کے سلسلے میں انہوں نے جتنے مضامین تیار کئے ان میں سے بیشتر مضامین کو بعد میں یکجا کر کے ’’عرفانِ نظر‘‘ کے نام سے کتابی شکل دے دی۔

۵۔ جدید اردو شاعری پر کل ہند سمینار، شری وینکٹیشورا یونیورسٹی، تروپتی، ۱۹۷۵ء
۶۔ پریم چند پر کل ہند سمینار، مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی، بھوپال، ۱۹۷۸ء
۷۔ پریم چند پر کل ہند سمینار، جموں، ۱۹۷۹ء
۸۔ پریم چند پر کل ہند سمینار، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد، ۱۹۸۰ء
۹۔ پریم چند پر کل ہند سمینار، حیدرآباد یونیورسٹی، حیدرآباد، ۱۹۸۱ء
۱۰۔ اقبال پر کل ہند سمینار، اقبال اکاڈمی، حیدرآباد، ۱۹۸۳ء
۱۱۔ اساتذہ کی کل ہند کانفرنس، مدراس یونیورسٹی، اورنگ آباد، ۱۹۸۳ء
۱۲۔ اردو میں علامت نگاری پر کل ہند سمینار، شری وینکٹیشورا یونیورسٹی، تروپتی، ۱۹۸۴ء
۱۳۔ اردو کا اثر ہندوستانی زبانوں پر، کولن (شملہ کے قریب Linguistice کا ایک ادارہ ہے)، ۱۹۸۴ء
۱۴۔ حیدرآباد میں بیرونی شعراء کل ہند سمینار، عثمانیہ یونیورسٹی، ۱۹۸۶ء
۱۵۔ نصابی منصوبہ بندی (Curricular Development)، علی گڑھ یونیورسٹی، ۱۹۸۶ء
۱۶۔ دکنی ادب پر کل ہند سمینار، دہلی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء
۱۷۔ اردو میں لوک ادب پر کل ہند سمینار، دہلی یونیورسٹی، ۱۹۸۸ء
۱۸۔ ہندوستان میں تانیثیت (Feminism) پر کل ہند سمینار، عثمانیہ یونیورسٹی، ۱۹۸۹ء
۱۹۔ اردو تدریس وتحقیق پر کل ہند سمینار، مدراس یونیورسٹی، ۱۹۹۰ء
۲۰۔ اردو ناول پر کل ہند سمینار، دہلی یونیورسٹی، ۱۹۹۰ء
۲۱۔ کرشن چندر اور ہم عصر افسانوی ادب، بمبئی، ۱۹۹۰ء
۲۲۔ جدید تنقیدی رجحانات کل ہند سمینار، دہلی اردو اکاڈیمی، ۱۹۹۳ء
۲۳۔ دکنی ادب پر کل ہند سمینار، عثمانیہ یونیورسٹی، ۱۹۹۵ء
۲۴۔ پریم چند کی عصری معنویت کل ہند سمینار، ڈاکٹر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء

انہوں نے جن بین الاقوامی سمیناروں میں شرکت کی ہے ان کی فہرست اس طرح ہے:

۱۔ مشترکہ تہذیب اردو ادب، کشمیر یونیورسٹی،

۱۹۸۴ء

۲۔ اردو رسم الخط، بمبئی، ۱۹۸۶ء

۳۔ اقبالؔ، اقبال اکیڈیمی حیدرآباد، ۱۹۸۶ء

۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد، علی گڑھ یونیورسٹی، ۱۹۸۹ء

۵۔ اقبال کا فکر وفن، کل ہند یونیورسٹی اردو اساتذہ کی انجمن، دہلی، ۱۹۹۲ء

۶۔ مرزا غالبؔ، غالبؔ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۱۹۹۲ء

۷۔ جنوبی ایشیاء میں قومی اور علاقائی ادبی تاریخ، سوشیل سائنس ریسرچ کونسل، نیویارک، ۱۹۹۳ء

۸۔ مرزا غالبؔ، ماریشس، ۱۹۹۴ء

۹۔ احیاء اسلام، ریسرچ فاؤنڈیشن آف اسلامک اسٹڈیز، شکاگو، ۱۹۹۵ء

رکن بورڈ آف اسٹڈیز

وہ مختلف تعلیمی اداروں میں بورڈ آف اسٹڈیز کے رکن کی حیثیت سے شرکت کر چکے ہیں۔

۱۔ رکن بورڈ آف اسٹڈیز، اردو، عربی اور فارسی، شری وینکٹیشورا یونیورسٹی، تروپتی

۲۔ رکن بورڈ آف اسٹڈیز، اردو، کالی کٹ یونیورسٹی، کیرالا

۳۔ رکن بورڈ آف اسٹڈیز، ویمنس کالج، انوار العلوم کالج، نظام کالج

۴۔ رکن نصابی منصوبہ بندی برائے پی جی کورسس، علی گڑھ یونیورسٹی، علی گڑھ

بحیثیت بیرونی ممتحن (External Examiner)

وہ ہندوستان کی مختلف جامعات میں بحیثیت ممتحن شرکت کر چکے ہیں۔ ایم فل اور پی ایچ۔ڈی ممتحن کی حیثیت سے جن جامعات میں تشریف لے گئے ان کی فہرست یوں درج ہے:

۱۔ کشمیر یونیورسٹی

۲۔ علی گڑھ یونیورسٹی

۳۔ میسور یونیورسٹی

۴۔ بنگلور یونیورسٹی

۵۔ شری وینکٹیشورا یونیورسٹی

۶۔ پنجاب یونیورسٹی

۷۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی

۸۔ بمبئی یونیورسٹی

۹۔ دہلی یونیورسٹی

۱۰۔ حیدرآباد یونیورسٹی

۱۱۔ مدراس یونیورسٹی

۱۲۔ بہار یونیورسٹی

تحقیق کے نگراں

یوسف سرمست نہ صرف ایک اچھے استاد تھے بلکہ اچھے نگراں بھی تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں دوران ملازمت یوسف سرمست کی زیر نگرانی جن اسکالروں نے ایم۔فل کی ڈگری حاصل کی ان کی فہرست اس طرح ہے:

۱۔ انیس النساء، حیدرآباد میں افسانہ نگاری، ۱۹۷۶ء

۲۔ سیف نصیر الدین احمد، فکر تونسوی شخصیت اور طنز نگاری، ۱۹۷۶ء

۳۔ محمد رشید الدین، علامہ حیرت بدایونی حیات اور کلام، ۱۹۷۶ء

۴۔ یوسف النساء، حیدرآباد میں اردو ناول کا ارتقاء، ۱۹۸۰ء

۵۔ غوثیہ بیگم، کرشن چندر کی ناولوں اور افسانوں میں افسانوی اقدار، ۱۹۸۰ء

۶۔ فرحت رخسانہ، شمالی ہند کے شعراء (۱۷۰۰ تا ۱۸۰۰) کا دکنی شعراء پر اثر، ۱۹۸۰ء

۷۔ میر احمد الدین علی خاں، میر عثمان علی خاں کی اردو ادبی خدمات، ۱۹۸۱ء

اطلاع

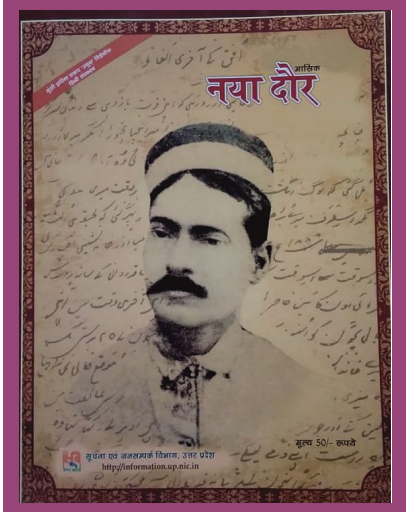

ادارہ ''نیا دور'' کی جانب سے شائع ہونے والے ''خمار بارہ بنکوی'' اور ''منشی دواریکا پرشاد افق لکھنوی'' نمبر اب دیوناگری رسم الخط میں بھی دستیاب ہیں۔ ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۵۰/روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپئے ملا کر کل قیمت ۱۰۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

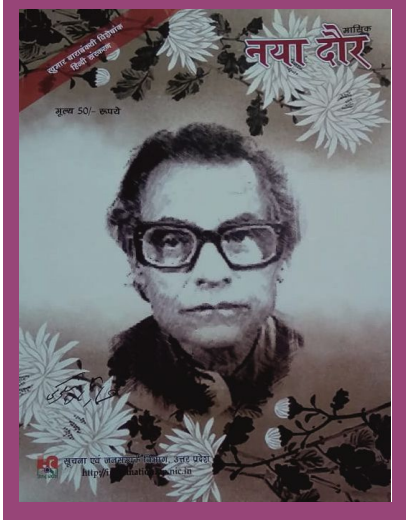

۸۔ محمد عبدالرشید ارشد، دبستان ولی کی شاعری میں قنوطیت، ۱۹۸۱ء

۹۔ فریدہ بیگم، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی شخصیت اور کارنامے، ۱۹۸۱ء

۱۰۔ میمونہ وحید، پطرس بخاری حیات اور کارنامے، ۱۹۸۱ء

۱۱۔ محمد شفاعت علی، ڈاکٹر سید عابد حسین حیات اور کارنامے، ۱۹۸۱ء

۱۲۔ عمادالدین علی خان، اردو زبان وادب کی ترقی میں میر عثمان خان کا حصہ،

۱۳۔ منیرالزماں، قدیر عزیز: حیات اور کارنامے

۱۴۔ سلمان عابد، سوغات کی بلیو گرافی

۱۵۔ جمیل احمد، اقبال متین: حیات اور کارنامے

۱۶۔ ساجدہ رحمانی، اردو انشائیے ابتدا سے ۱۹۳۶ء تک

۱۷۔ عشرت نواز بیگم، اردو ناولوں میں لکھنوی تہذیب کی پیشکشی

۱۸۔ وسیم النساء بیگم، اردو ناول کے مزاحیہ کردار ۱۹۴۷ء سے پہلے

۱۹۔ عطیہ سلطانہ اردو یونیورسٹی کا تصور اور جامعہ عثمانیہ کا قیام، ۱۹۸۲ء

۲۰۔ یاسمین خان، پریم چند کے ناولوں میں اخلاقی اقدار، ۱۹۸۲ء

۲۱۔ سیدہ عاصمہ، عزیم احمد بحیثیت ناول نگار

۲۲۔ نعیم الدین، عثمانیہ یونیورسٹی کے تحقیقی مقالوں کا تنقیدی جائزہ

۲۳۔ ریحانہ پروین، پریم چند کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

۲۴۔ تاتار خان، مرزا ادیب بحیثیت ڈرامہ نگار

۲۵۔ فاطمہ بی، ڈاکٹر زور اور ان کے رفقاء

۲۶۔ قطب الدین، اکبر الدین صدیقی حیات اور ادبی خدمات

پروفیسر یوسف سرمست کی نگرانی میں مندرجہ ذیل پی ایچ۔ڈی کے مقالے مکمل ہوئے:

۱۔ میمونہ بیگم، پروفیسر عبدالقادر سروری حیات اور خدمات

۲۔ عزت النساء اردو سفرنامے

۳۔ میمونہ وحید، پروفیسر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی حیات اور خدمات

۴۔ یاسمین خانم، جامعہ عثمانیہ کی خدمات زبان و ادب

۵۔ عطیہ سلطانہ، دیوان غواصی کی تدوین

۶۔ رفیع رؤف، اردو ادب میں ۱۹ویں صدی کی تہذیب

۷۔ ڈاکٹر سلمان عابد، اردو زبان ادب کی تحقیق و تنقید میں مستشرقین کا حصہ

۸۔ ڈاکٹر عبدالحکیم، تنقید نگاری آزادی کے بعد

۹۔ ڈاکٹر ریحانہ پروین، گھریلو ناولوں کا تنقیدی جائزہ ابتداء تا ۱۹۳۶ء

۱۰۔ محمد شفاعت علی، اردو ناول میں سماجی مسائل، ۱۹۹۸ء

۱۱۔ ریحانہ پروین، اردو ناول اور گھریلو مسائل، ۱۹۹۸ء

۱۲۔ اقبال جہاں، اردو میں خطوط نگاری، ۱۹۹۸ء

۱۳۔ بشیر خان، خلیفہ عبدالحکیم (عبدالحکیم)، ۲۰۰۰ء

عزازی مدیر

وہ بحیثیت اعزازی مدیر جن رسائل سے جڑے رہے ان میں سہ ماہی ''مبصر''، حیدرآباد، (نظام ٹرسٹ لائبریری)، سالانہ ''مجلہ تحقیقات اردو''، حیدرآباد (جامعہ عثمانیہ شعبہ اردو)، اور ماہنامہ ''دور کے لوگ''، کنیڈا (ہندوستانی مدیر) وغیرہ اہم ہیں۔

انعامات واعزازات

ان کی تمام شائع شدہ کتابوں پر آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی، اتر پردیش اردو اکیڈیمی، بہار اردو اکیڈیمی نے انعامات واعزازات سے نوازا ہے۔

ان کی تنقید کے مجموعی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تنقید میں کسی ایک بات پر اصرار نہیں کرتے بلکہ تنقید کرتے وقت فن پارے کی خوبیوں اور خامیوں کا مطالعہ اعتدال سے کرتے ہیں۔ ان کی تنقید کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ صرف ایک نظریہ کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ ادب کے مطالعے کے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں ان کی طرف اشارے کرتے ہیں اور انہیں ادب کے مطالعے کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔ وہ مغربی اثرات کو آنکھ بند کر کے قبول کرنے پر بھی اپنی ناراضگی جتاتے ہیں بلکہ وہ ادب میں مشرقی اقدار اور روایات کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی تنقید میں تاثراتی، جمالیاتی، تاریخی و سماجی اور تہذیبی پہلوؤں پر زور ملتا ہے۔ وضاحت وصراحت بھی ان کی تنقید کا خاص وصف ہے۔ غرض معروضی نقطہ نظر سے وہ ادب کے مطالعے پر زور دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید آرا کی روشنی میں ہم انہیں اردو کے سائنٹفک ناقدین میں بجا طور پر جگہ دے سکتے ہیں۔

حواشی

۱۔ شخصی انٹرویو، پروفیسر یوسف سرمست، کنعان۔۲، جرنلسٹ کالونی، جوبلی ہلز، حیدرآباد، ۵ مارچ ۲۰۱۷ء

۲۔ شخصی انٹرویو، پروفیسر یوسف سرمست، کنعان۔۲، جرنلسٹ کالونی، جوبلی ہلز، حیدرآباد، ۵ مارچ ۲۰۱۷ء

۳۔ روزنامہ سیاست ۵ مارچ ۲۰۰۱ء

۴۔ شخصی انٹرویو، پروفیسر یوسف سرمست، کنعان۔۲، جرنلسٹ کالونی، جوبلی ہلز، حیدرآباد، ۵ مارچ ۲۰۱۷ء

❑❑❑

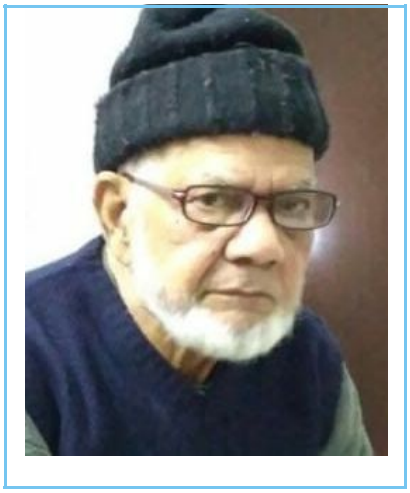

اب تو بس آواز ہی آواز ہے: شفاعت علی صدیقی

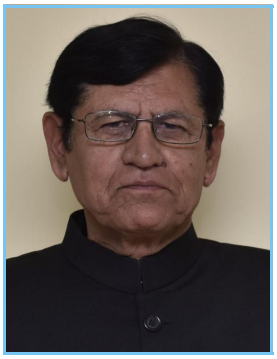

رفعت عزمی

B-314

سول لائنس

بارہ بنکی

رابطہ: 9451818310

اس طرح جی کہ بعد مرنے کے
کوئی تو یاد گاہ گاہ کرے

یہ سال 1981ء کی بات ہے جب میں بدایوں سے کسی کام کے سلسلہ میں لکھنؤ گیا تھا، جہاں میں ایڈیشنل انفارمیشن آفیسر کے طور پر تعینات تھا۔ وقت نکال کر میں آل انڈیا ریڈیو کے اردو پروڈیوسر شفاعت علی صدیقی سے ملاقات کرنے ان کے دفتر پہنچا اور یہ دریافت کرنے بھی کہ آیا میری کوئی ریکارڈنگ عنقریب معین تو نہیں ہے۔ دوران گفتگو شفاعت علی صدیقی مختلف موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر نکل آئے اور مزید کچھ کہنے سے پہلے اپنی معاون اوما چکبست کے دفتر سے جانے کا انتظار کرنے لگے، جو مجھے انہوں نے اشارے سے سمجھایا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد گویا ہوئے کہ عزمی میاں کل سے بہت پریشان ہوں، سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا جائے۔ میں تعجب سے انہیں تکتا رہا لیکن میں نے ان سے پوچھ ہی لیا کہ شفاعت صاحب آخر ایسی کیا بات ہے کہ جس وجہ سے آپ اتنے فکرمند نظر آرہے ہیں۔ شفاعت علی صدیقی نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ بتایا کہ وزارت اطلاعات ونشریات حکومت ہند کی جانب سے آکاش وانی لکھنؤ سے نشر ہونے والے اردو خبروں کے بلیٹن کو بند کیے جانے کی رپورٹ تیار ہورہی ہے۔ اس بارے میں کرائے گئے ایک سروے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔

سروے وزارت کی ہدایت کے مطابق کیا گیا ہے۔ اس میں اردو خبروں کے سامعین کی تعداد مایوس کن حد تک کم ہونے کے اعداد وشمار موجود ہیں۔ جن کے لئے انہوں نے سرکاری سطح پر ہر ممکن کوشش کی۔ ان کی محنت بارآور ہوئی اور ریاست میں اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوا۔ آکاش وانی لکھنؤ سے اردو خبروں کے بلٹین کی نشریات میں اردو کے خاموش مجاہد شفاعت علی صدیقی کی حکمت عملی کا بڑا عمل دخل رہا لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ لوگوں نے بہت جلد ان کی خدمات کو فراموش کر دیا۔ اس کی ایک تاریخی مثال یہ ہے:

لکھنؤ میں 5 اگست 2018 کو اتر پردیش اردو اکادمی اور فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے اشتراک سے معروف ادیب اور افسانہ نگار پروفیسر نیر مسعود کی ادبی خدمات کے سلسلہ میں ایک سمینار کا اہتمام کیا گیا، جس میں ملک

کی سرکردہ ادبی شخصیتوں نے شرکت کی اور مقالات پیش کیے۔اس سیمینار میں تقریباً وہ تمام دانشوران موجود تھے جنہیں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے اردو پروگراموں میں وقتاً فوقتاً اپنی تخلیقات اور تصنیفات پیش کرنے کا موقع شفاعت علی صدیقی نے فراہم کرایا تھا۔لیکن افسوس کا مقام ہے کہ منتظمین نے انہیں خراج عقیدت پیش کرنا مناسب نہیں سمجھا۔حالانکہ آج بھی بہت سے ادیب،شعرااور فنکار ان کی خدمات کے مداح اور معترف ہیں۔

یوں تو شفاعت علی صدیقی کا دائرہ کار بہت محدود تھا لیکن آکاش وانی کے پروگراموں کی وجہ سے ان کی آواز دور دور تک پہنچ جاتی تھی۔انہوں نے ریڈیو کے لیے بہت سے معیاری فیچر تحریر کیے جنہیں وہ خود پیش کیا کرتے تھے۔شفاعت علی صدیقی کی ولادت ریاست اتر پردیش کے ضلع ہردوئی کے مردم خیز قصبہ سندیلے میں 15جولائی 1029 کو ہوئی تھی۔آپ کے والد کا نام عنایت علی تھا۔ابتدائی تعلیم سندیلے میں حاصل کی اور اس کے بعد لکھنؤ سے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات کوئنس کالج سے پاس کیے۔انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے 1952 میں گریجویشن کیا۔واضح ہو کہ وہ شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کے چھوٹے بھائی تھے۔شفاعت علی صدیقی میں بظاہر انسانیت کے تمام مثبت عناصر موجود تھے،جن میں شرافت ،عزت نفسی ،متانت، انکساری،شفقت، رحم دلی، ادب و احترام،نرم گفتاری،تہذیب ونفاست وغیرہ شامل ہیں۔

آپ 1971 میں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں پروڈیوسر بنائے گئے اور بعد میں سینئر پروڈیوسر کے عہدے پر ترقی پا کر اپنے کارہائے نمایاں انجام دیتے رہے۔آپ کو تین بار آکاش وانی کے قومی اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔1974 میں ایک عمدہ فیچر کے لیے پہلا، 1977 میں امیر خسرو پر فیچر کی خاطر دوسرا اور 1981 میں مہاتما گاندھی کے یوم شہادت (30 جنوری) پر نشر 'قدم قدم لہو' فیچر کے واسطے انہیں اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔لکھنؤ کی مشہور چکن کاری پر 'دھاگے کے پھول' عنوان سے آپ کا فیچر بہت پسند کیا گیا اور انہیں مختلف اعزازات حاصل ہوئے۔مئی 1897 میں آپ امیر خسرو سوسائٹی ،امریکا کی دعوت پر شگاگو تشریف لے گئے جہاں ان کی بہت پذیرائی ہوئی۔شفاعت علی کے پیش کردہ بچوں کے پروگرام ، یہ بستیاں ہماری (شخصیات پر) ، بولتی تحریریں ،(کلاسیکی ادب پر)، لکھنؤ کے محلے گلی گلی آباد تھی جن سے (صنعت وحرفت سے متعلق) وغیرہ فیچر بہت سراہے گئے۔اس کے علاوہ مجلس شام غریباں کی ریکارڈنگ کے نشریہ سے قبل ان کی پرسوز اور پاٹ دار آواز میں شہدائے کربلا کو جس انداز سے خراج عقیدت پیش کیا جاتا تھا وہ آج بھی ذہنوں میں محفوظ ہے۔شفاعت علی صدیقی 31/جولائی 1987 کو اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔اپنی صلاحیت اور غیر معمولی کارکردگی کے سبب انہیں پروڈیو سرایمیریٹس کے عہدے پر آل انڈیا ریڈیو نے دوبارہ اپنے عملہ میں شامل کرلیا۔اس کے بعد انہوں نے فیچر' اودھ میں اردو غزل کا سفر گزشتہ صدی میں' شروع کیا ،جس میں اسکرپٹ رائٹرس کے طور پر نوجوان شعرا کا تعاون حاصل کیا اور اس سلسلے میں 11 پروگرا قسط وار پیش کیے گئے۔انہوں نے 1945 میں اسٹاف آرٹس کے طور پر اپنے ریڈیائی سفر کا آغاز کیا تھا اور مختلف شعبوں اور شہروں میں خدمات انجام دینے کے بعد اسکرپٹ رائٹر کے طور پر آکاش وانی لکھنؤ سے وابستگی اختیار کی تھی۔خاص طور پر ہر مذہب وملت کے تہواروں کا خیال رکھتے ہوئے انہی کی مناسبت سے پروگرام بھی ترتیب دیتے تھے۔انہوں نے فروغ اردو میگزین کی اشاعت میں بھی اپنا مثبت تعاون دیا اور لکھنؤ سے شائع اردو روزنامہ 'قومی آواز' کے ہفتہ وار ضمیمہ کی ادارت کی ذمہ داری بحسن وخوبی انجام دی۔

شفاعت علی صدیقی کا انتقال یکم اگست 2018 کو لکھنؤ میں ہوا اور جب یہ خبر سوشل میڈیا کے توسط سے مجھ تک پہنچی تو اردو خبروں کے بلیٹن کا نشریہ بند کیے جانے سے متعلق تمام تر باتیں مجھے یاد آگئیں، کیوں کہ وہ سب میری دانست کے علاوہ شاید ہی کسی کے علم میں ہوں۔لہٰذا انہیں محفوظ کرنا میں نے اپنا فریضہ سمجھا ورنہ یہ بڑی ناانصافی اور بددیانتی کی بات ہوتی۔

شفاعت علی صدیقی کی اردو سے بے لوث محبت کا تذکرہ ہی ان کو حقیقی خراج عقیدت ہے۔مجھے اس بات کا کامل یقین ہے۔میرے حافظے میں جو محفوظ تھا اسے میں نے سپرد الفاظ کردیا،تاکہ وہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔اس طرح اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے میں بھی کامیاب ہوسکا ہوں۔شفاعت علی صدیقی کے فیچروں کی تعداد تین ہندسوں کو چھو چکی تھی۔وہ بار بار صرف ارادہ کرتے رہے کہ ان فیچروں کو کتابی شکل میں شایع کرادیا جائے،تاکہ ریڈیائی ادب کے حوالے سے کچھ اہم نکات اور معلومات محفوظ ہوسکیں،عمر کے آخری پڑاؤ تک پہنچتے پہنچتے ان کی بصارت جواب دے گئی اور غالباً ہمت بھی۔اس طرح یہ قصہ تمام ہوگیا۔

اتفاقاً ایک بار اردو لی کا ذکر چھڑ گیا۔شفاعت علی صدیقی بتانے لگے کہ آل انڈیا ریڈیو کے 'آرگن' آواز کا نام جاز نے تجویز کیا تھا اور وہ اس کے نائب مدیر بھی تھے پھر گویا ہوئے کہ اس ماہ (نام یاد نہیں آرہا ہے) کے 'آواز' میں آکاش وانی لکھنؤ سے نشر ہونے والی دو غزلیں شامل کی گئی ہیں،جس میں سے ایک غزل آپ کی بھی ہے، لیکن یہ 'آواز' کا آخری شمارہ ثابت ہوگا، کیونکہ جریدے کی اشاعت منقطع کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔'آواز' کے آغاز اور انجام دونوں میں اردو لوی حضرات کا تعاون رہا ہے۔لہٰذا آپ کو باور کرانا ضروری سمجھتا ہوں۔

میں ان کی باتیں غور اور توجہ کے ساتھ سنتا رہا۔وہ بھی ریکارڈنگ کے سلسلے میں آئندہ کی ملاقات کا وعدہ کرتے ہوئے اسٹوڈیو جانے کا ارادہ کررہے تھے۔میں اجازت حاصل کرکے ان کے کمرے سے باہر آگیا۔

❑❑❑

اقبال کا نظریۂ تصوف

صفت زہرا

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو

الٰہ آباد یونیورسٹی

الٰہ آباد

رابطہ: 8318617208

اس سرزمین پر خدا کی بنائی ہر شئے قابل تعریف اور حیرت انگیز ہے۔ یہ زمین آسمان، چاند ستارے، پھول اور پھل، دل و دماغ کو معطر کرتی ہوئی ہوا، خوشبو، بہتے دریا، دلکش آبشار اور نہ جانے کیا کیا۔ جہاں یہ فطرت دل کو سکون عطا کرتی ہے وہیں دوسری طرف انسانی ذہن کو منتشر بھی کرتی ہے اور تعجب و تجسس بھی پیدا کرتی ہے۔ ان تمام تخلیق میں سب سے نمایاں اور حیرت انگیز شئے آدم کی ذات ہے۔ جسے خدا نے سب سے افضل بنایا اور اشرف المخلوقات کے لقب سے نوازا۔ انسان خدا کی سب سے عظیم مخلوق ہونے کے ساتھ ساتھ بہت پیچیدہ بھی ہے۔ کیونکہ خدا نے انسان کو عقل، عشق، ذہن، زبان اور غور و فکر جیسی نعمتیں عطا کی۔ ان تمام تر صلاحیتوں کے بعد آج بھی انسان اس کشمکش میں مبتلا ہے کہ یہ خصوصیات ہمارے لئے باعثِ زینت اور نعمت ہیں یا کہ ایک عذاب کی مانند ہیں۔ کیونکہ آج بھی انسان ان کے خاطر خواہ استعمال سے آگاہ نہیں ہے۔ انسانی ذہن نے کتنی بھی ترقی کر لی ہو، تمام طرح کے ایجادات کر لئے ہوں مگر صحیح غلط، نیکی بدی کی پرکھ کے سلسلے میں کوئی مشین نہیں بنائی ہے۔ کیوں؟ کب؟ کیسے؟ اور کہاں؟ جیسے سوالات ہمیشہ انسانی فکر کا حصہ رہے ہیں۔ اور جب تک وہ ان کا معقول جواب نہیں حاصل کر لیتا اطمینان قلب حاصل نہیں ہوتا۔

رب العزت انسانی ذہن کی ہر کشمکش سے آگاہ تھا اور ہمیشہ رہتا ہے۔ خدا کو یہ بھی معلوم تھا کہ جب انسان ارتقاء کی منزل طئ کرتے ہوئے عروج پر پہونچے گا تو خدا کی خدائی پر بھی سوال کرے گا۔ اس لئے پروردگار نے تخلیق بشر سے قبل ہی ایک ہادی و رہنما کو زمین پر بھیجا۔ جس کو ہم حضرت آدمؑ کے نام سے جانتے ہیں۔ شاید ایسا کرنے کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ کوئی بھی بشر یہ سوال نہ کر سکے کہ مجھے کسی نے صحیح اور غلط کا درس نہ دیا۔ قرآن پاک میں اللہ فرماتا ہے۔ ''ولکلِ قومٍ ھادٍ'' مطلب ہر قوم کے لئے ہادی بھیجا گیا ہے۔

یہ سلسلہ حضرت آدم سے شروع ہوتا ہے اور رسول خدا ختم النبیاء مرسلین محمدؐ پر آ کر ختم ہوتا ہے۔ اس دوران ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر فرش پر بھیجے گئے۔ ان تمام انبیاء کرام نے اشرف المخلوقات کی رہنمائی کی۔ اور آخر میں چودہ سو برس پہلے ایک صراطِ مستقیم عطا کیا۔ جس پر چل کر رضائے الٰہی حاصل کی جا سکے۔

چودہ سو برس پہلے اسلام مکمل ہو گیا اور وحیٔ الٰہی آ گئی کہ آج تم پر دین مکمل ہو گیا۔ اب اس میں کسی قسم کی کمی یا زیادتی کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ قرآن پاک اور انبیاء کرام کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے رہنمائی کا سلسلہ لگاتار جاری رہا۔ نبیؐ کریم کے بعد ان کے اہلِ بیت اور صحابہ کرام نے پیروی کی پھر یہ سلسلہ صوفیاء کرام سے منسلک ہو گیا۔

اسلام اور اس کے قانون وقت کے پابند نہیں ہیں۔ ان کو حال، مستقبل اور ماضی کے دائرے میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لا فانی ہیں۔ اہل تصوف بھی تصوف کے وجود کو اسلام کے وجود کے ساتھ ہی مانتے ہیں۔ اس سلسلے میں خواجہ حسن ثانی نظامی اپنے مضمون ''تصوف، تاریخ و تہذیب، رسم و حقیقت'' میں کہتے ہیں:

''اہل تصوف لفظ تصوف کو اسلام کے ساتھ جڑا ہوا سمجھتے ہیں۔ تصوف کی تاریخ اسلام کے مکمل ہونے کے بعد نہیں بلکہ اسلام کے ساتھ ساتھ ہی شروع ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی موجودگی اس اسلام کے زمانے میں بھی نظر آتی ہے جو پیغمبر آخر الزماں سے پہلے دوسرے انبیاء علیہ السلام کے ذریعہ انسانوں کے لئے اپنے اپنے وقت پر آتا رہا۔ اور کسی نے بھی اور کبھی بھی قابل ضبطی اور منسوخی نہیں سمجھا۔ ''کسی'' سے مراد انبیاء علیہ السلام اور شریعت لانے والوں سے ہے۔''

(تصوف اور ہندوستانی معاشرہ۔ مرتب: پروفیسر محی الدین بمبئی والا۔ ص ۱۲)

صوفیوں کا اصل مقصد اسلام اور اس کے اصولوں کو رائج کرنا اور لوگوں کی اصلاح کرنا تھا۔ اس لئے خان کاہیں آباد ہوئی اور وہاں لوگوں کو درس دینا شروع کیا گیا۔ یہاں پر صرف کتابی علم ہی نہیں تھا بلکہ اسلامی تعلیمات کو اخلاقی سانچے میں ڈھال کر لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا۔

تصوف پر بات کرنے سے قبل یہ سمجھنا ضروری ہے کہ تصوف ہے کیا؟ اور اس کی ارتقاء کے کیا سلسلے رہے ہیں۔ تصوف وہ ہے کہ جس میں تزکیۂ نفس، طہیر نفس اور تجلیٔ باطن کر کے ایسا پاک اور صاف بن جانا کہ رضائے الٰہی حاصل کر سکے۔ روح کی پاکیزگی اور اخلاق کی بلندی سے خود کو رضائے الٰہی کے عین مطابق بنالینا۔ صوفی اس بات پر مکمل یقین رکھتا ہے کہ خدا واحد ہے، خیر و شر کا خالق ہے، خدا کا وجود ہی حقیقت ہے، بقیہ سب فریب نظر ہے۔ انسان کا ہر عمل تقرب الٰہی کے لئے ہی ہونا چاہئے۔

چند معتبر شخصیات نے تصوف کی تعریف کچھ یوں کی ہے۔ شیخ شہاب الدین سہروردی کہتے ہیں:

''تصوف ایک جامع و مانع لفظ ہے فقر اور زہد سب پر حاوی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ زہد اور فقر کے علاوہ کچھ اور بھی اوصاف اور اضافات ہیں جب تک وہ نہ پائیں جائیں صوفی صحیح معنوں میں صوفی کہلانے کا حقدار نہیں وسکتا اگر چہ وہ زاہد اور فقیر کیوں نہ ہو۔''

تصوف کے سلسلے میں جنید بغدادی کی رائے کافی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''تصوف یہ ہے کہ حق مجھے تیرے وجود سے الگ کر کے ہلاک کر دے اور پھر جو زندگی وہ تجھے دے وہ صرف اسی کے لئے ہو۔ میرا تصوف قرآن اور سنت میں مقید ہے۔ جو بات قرآن اور حدیث سے ثابت نہ ہو وہ مردہ ہے۔''

صوفی تصور عرفان پر زور دیتا ہے۔ عرفان اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جسے شعور کی پختگی حاصل ہو۔ صوفی کا کہنا ہے کہ علم کی تین قسمیں ہوتی ہیں:

۱۔ خدا سے علم
۲۔ خدا کے ساتھ علم
۳۔ خدا کا علم

خدا کا علم وجدان ہے۔ پیغمبر اور اولیاء اسی کے ذریعے علم حاصل کرتے تھے۔ خدا کے ساتھ علم مدارج کا علم ہے۔ جو ایک سالک کو راہ حقیقت میں پیش آتے ہیں۔ تصوف کے سلسلے میں بہت ساری باتیں سامنے آتی ہیں۔ کچھ نے تصوف کو صوف یعنی ایک خاص قسم کے کپڑے سے مشتق قرار دیا ہے۔ کچھ نے صفہ سے صوفی بنایا۔ بعض کا خیال ہے کہ اہل بیت سے اظہار محبت رکھنے والوں نے حکومت وقت کے جبر و تشدد سے پناہ لینے کے لئے یہ تحریک شروع کی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب ''تاریخ مشائخ'' میں اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

تصوف کا لفظ دوسری صدی ہجری میں رائج ہوا۔ اسلامی تصوف کا ارتقاء بھی دوسری صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے۔ بیشتر محقق کی رائے میں تصوف کا سلسلہ حسن بصریؒ، ابو ہاشم، ابراہیم بن ادہم، رابعہ بصریؒ اور سفیان نوری وغیرہ سے شروع ہوتا ہے۔ تصوف کے ارتقاء کے سلسلے میں عبدالماجد دریابادی رقم طراز ہیں:

''تصوف کی تحریک کا آغاز صوفیائے کرام کے مطابق ساتویں صدی عیسوی سے ہی شروع ہو جاتا ہے اور پہلے صوفی حضرت اویسؔ قرنی قرار دیے جاتے ہیں جنھوں نے عشق رسول میں اپنے دانت توڑ ڈالے تھے۔''

صوفیائے کرام کے یہ چار خانوادے ہیں۔ نقش بندیا کو چھوڑ کر سب حضرت علی سے شروع ہوتے ہیں اور سلسلۂ چشتیہ حضرت علی کے بعد خواجہ حسن بصری سے شروع ہوتا ہے بقیہ میں شیعوں کے چھٹے امام تک اور بعد میں ساتویں اور آٹھویں امام تک یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں صوفیائے کرام کی آمد کا سلسلہ مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں تارا چند اپنی کتاب میں تفصیلی گفتگو کرتے ہیں۔

''محمود کے حملے کے بعد بکثرت مسلمان

اہل علم اور مردان حق ہندوستان آئے یہ ممکن نہیں کہ اس سب کی کوئی فہرست مرتب کی جا سکے لیکن بعض اہم شخصیتوں کا ذکر یہاں کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک کشف المحجوب کے مصنف علی ابن عثمان الہجویری تھے جو غزنہ کے رہنے والے تھے۔ اور جو مسلمان ممالک کا وسیع دورہ کر کے لاہور آئے اور وہیں ۴۶۵ھ یا ۴۶۹ھ میں انتقال کیا۔ شیخ اسمٰعیل بخاری نے گیارہویں صدی کے شروع میں ہندوستان کا دورہ کیا۔ خواجہ معین الدین چشتی ۱۱۹۷ء میں اجمیر آئے اور وہیں ۱۲۳۴ء میں انتقال کیا۔ تیرہویں صدی میں شیخ جلال الدین تبریزی شاگرد شہاب الدین سہروردی بنگال آئے۔ ۱۳۸۸ء میں سید محمد گیسودراز نے پونا اور بلگرام کے اضلاع میں لوگوں کو مسلمان کیا۔ دیگر مشہور صوفیائے کرام جو ہندوستان آئے یا یہاں آ کر آباد ہوئے۔ سید میر بن عبدالقادر جیلانی بانی فرقہ قادریہ قطب الدین بختیار کاکی جن کی مزار دہلی میں ہے اور جن کے نام سے قطب مینار منسوب ہے۔ بہا الدین ذکریا اور جلال الدین سرخ پوش جو ملتان اور کوچ میں رہے۔ اسکے علاوہ قلندر درویش شاہ مدار گیارہویں صدی اور سخی سرور بارہویں صدی کے ہیں۔''

اس طرح اگر ہم تاریخ کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ صوفیائے کرام ہندوستان میں آئے اور یہاں پر بس کر اسلام اور اس کے اصولوں کو عام کیا۔ اسلامی تصوف کا اثر ہندوستانی تہذیب اور معاشرے پر بھی پڑا اور یہاں بھی بھگتی تحریک کا آغاز ہوا۔ تصوف کی تحریک جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی اس میں مختلف نظریے شامل ہوتے گئے۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور نظریہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا تھا۔ اس نظریہ کے ماننے والے خدا کی وحدانیت کے قائل تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ علم کا تعلق قلب سے ہے جس پر تجلی ظاہر ہوتی ہے اور حقیقت کا براہ راست عرفان ہوتا ہے۔ روح کا مقصد وصل الٰہی ہے۔ وہ سب کچھ خیر ہے جو اس میں ممد و معاون ہو۔ اور وہ سب شر ہے جو اس سے روکے۔ اس نظریہ کے ماننے والے خدا کے وجود میں خود کو ضم کر دینے کے حامی تھے۔ مثلاً ؎

'قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے'

تصوف کی تحریک کا اثر اردو ادب پر بھی نظر آتا ہے۔ زیادہ تر شعراء اس تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اس فہرست میں علامہ اقبال کا نام پیش پیش ہے کیونکہ علامہ کے کلام کا بیشتر حصہ اسلامیات کی روشنی میں ہے جس میں تصوف کا رنگ بھی شامل ہے۔ اقبال اپنے عہد کے ایک بڑے دانش ور اور فلسفی گزرے ہیں۔ وہ عالمی ادب کے سب سے پڑھے لکھے شاعر تھے۔ ان کا مطالعہ اور تجربہ بہت عمیق تھا۔ ان کی وسیع النظری سے علم کا کوئی گوشہ خالی نہ تھا۔ اسلامی تعلیمات، قرآن اور حدیث کا گہرا مطالعہ، فلسفہ اور مختلف علوم کی معلومات سے انھوں نے اپنا ایک الگ زاویۂ نگاہ تراشا تھا جس کا قائل آج تک سارا زمانہ ہے۔

علامہ اقبال اور تصوف کے بارے میں کافی باتیں ہو چکی ہیں۔ علامہ کا سارا کلام تصوف ہی ہے۔ کیونکہ ان کا زیادہ تر کلام اسلام اور قرآن کی روشنی میں ہی ہے اور اہل تصوف بھی تصوف کی بنیاد قرآن اور اسلام کے اصولوں سے استوار کرتے ہیں۔ اقبال کے یہاں جو الٰہیات کے حقائق کا نظریہ ہے اسے منطق اور ذہانت و فکر کے ساتھ پیش کیا جائے تو فلسفہ ہے اور اگر ذاتی احساسات اور وجدان کے ساتھ پیش کریں تو تصوف ہے۔ اقبال کی نظر میں اسلام اور اس کی تعلیمات کا ایک اعلیٰ مقام ہے۔ اقبال نے اسلام کے ان اصولوں کا مطالعہ کیا اور عمل پیرا بھی ہوئے جن پر چل کر انسان رضائے الٰہی بھی حاصل کر سکتا ہے اور دنیا اور آخرت میں سرخرو بھی ہو سکتا ہے۔ علامہ نے اپنے اکتسابی علم کی بنا پر کچھ ذاتی نظریے اور اصطلاحات قائم کیں جیسے مرد کامل، شاہین، وجدان، مسلسل کوشش وغیرہ اور ان اصطلاحات کو اپنی شاعری میں برتا اور قوم کی رہنمائی کرنے کی کوشش کی۔ اقبال نے اسلام سے ہمیشہ مسلسل محنت و مشقت، جہد و عمل، سعی و مشکور کا درس حاصل کیا۔ لیکن اقبال کا یہ بلند تصور مروجہ زمانے کے تصوف سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے اقبال نے ایسے تصوف کو مسلمانوں کے زوال کا ذمہ دار سمجھا اور اس کی سخت تنقید کی۔

اقبال تصوف کے خلاف نہ تھے۔ وہ نظریۂ وحدت الوجود کے بھی خلاف نہ تھے مگر تصوف کے سلسلے میں ان کی جو بھی رائے تھی وہ گہرے مطالعے کا نتیجہ تھی۔ انھوں نے ایک دانش ور کی طرح سوچا اور رائے دی۔ ڈاکٹر سید اللہ سے ملاقات کے دوران اقبال نے تصوف کے سلسلے میں کچھ باتیں کیں۔

''اسلام کے اولین دور کے صوفی زہاد تھے۔ زہد اور تقویٰ ان کا مقصد تھا۔ بعد کے تصوف میں مابعد الطبیعیات کا اضافہ نظر آتا ہے۔۔۔۔ اس میں فلسفے کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ ہمہ اوست مذہبی مسئلہ نہیں یہ فلسفہ کا مسئلہ ہے۔ وحدت و کثرت کی بحث سے اسلام کا کوئی سروکار نہیں۔ اسلام کی روح توحید ہے۔ اور اس کی ضد کثرت بلکہ شرک ہے، وہ فلسفہ اور وہ مذہبی تعلیم جو انسانی شخصیت کی نشوونما کی منافی ہو بیکار چیز ہے۔ گوش اور چشم کو بند کرنا اور صرف چشم باطن پر زور دینا جمود اور انحطاط ہے۔ خالص اسلامی تصوف یہ ہے کہ احکام الٰہی انسان کی اپنی ذات کے احکام بن جائیں۔''

(اقبال اور تصوف، محمد شریف بقا، ص:۳۶)

تصوف کے سلسلے میں ''وکیل'' نامی رسالے میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ:

''تصوف کی تحریک غیر اسلامی عناصر سے خالی نہیں اور اگر میں مخالف ہو تو صرف ایک گروہ کا جس نے محمدؐ کے نام پر بیعت لے کر دانستہ یا نا دانستہ ایسے مسائل کی تعلیم دی جو مذہب اسلام سے تعلق نہیں رکھتے ہیں۔''

(اقبالؔ اور تصوف، محمد شریف بقا، ص:۳۶)

اقبالؔ تصوف کے مخالف نہیں تھے بلکہ وہ سلسلۂ قادریہ سے بیعت بھی رکھتے تھے اور ارمغان حجاز اور اپنی مقدم تحریروں کی روشنی میں وہ نسبت اولیٰ کے پہرے دار ٹھہرتے ہیں۔ مگر تصوف کے عین اسلامی ہونے کے حمایتی ہیں۔ جو تصوف انھیں قرآنی تعلیمات اور اصولوں کے ہم آہنگ نظر نہیں آتا ہے اسے قبول نہیں کرتے ہیں۔ تصوف کے سلسلے میں وحدت الوجود کی بحث ایک مسئلہ ہے۔ وحدت الوجود کے ماننے والے خدا اور کائنات میں فرق نہیں کرتے ہیں۔ وہ خدا کے وجود کو ہی حقیقی مانتے ہیں۔ اور باقی کسی بھی چیز کی کوئی حقیقت اور حیثیت نہیں ہے۔ اس نظریہ کے پس منظر میں ایک طویل روایت جڑی ہے۔ مسلمانوں کے زوال نے ہندوستان میں اس نظریہ کو جلا بخشی۔ اردو ادب میں بھی وحدت الوجود کے کے نظریہ کی بنیاد اسی زوال آمادہ معاشرے کی پیداوار ہے۔ چونکہ دربار تو اب رہ نہیں گئے تھے اب صرف درگاہ کا سہارا باقی رہ گیا تھا۔ لوگوں میں قناعت پسندی اور توکل پیدا ہونے لگی جو اصل قناعت سے تھوڑا مختلف تھی۔ قسمت کے بھروسے رہنا، ہاتھ پر ہاتھ کر بیٹھنا یہ سب اسی زوال آمادہ معاشرے کی دین تھی۔

ایسے میں جد و جہد مسلسل سعی و مشکور۔ جیسے نظریہ لوگوں کے ذہن سے دور ہو گئے تھے۔ علامہ اسی کے خلاف کھڑے ہوتے ہیں۔ ابتدائی دور میں وہ اس کے حامی دکھائی پڑتے ہیں مگر اپنے تجربے اور مطالعے کے بعد وہ اس نظریہ کی سخت مذمت کرتے ہیں۔ وہ اس کے بالکل خلاف تھے کہ انسان اپنے وجود کو ہی کھودے اور قسمت کے بھروسے بیٹھ جائے۔ وہ خودی کا استحکام چاہتے ہیں۔ تعین ذات احساس نفس سے وہ ایک مقام بندگی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے ''مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی''۔ اقبالؔ کو خدائی اور اپنی بندگی پر فخر ہے۔ وہ نظریۂ وحدت الوجود کے طرز پر اپنا وجود ختم کر دینے کے حامی نہیں ہیں بلکہ اپنی کوششوں اور پیہم عمل سے بندگی کے اس مقام پر کھڑا ہونا چاہتے ہیں کہ جہاں:

'خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے'

صوفیائے کرام کا نظریہ قسمت پر قناعت کرنے کا تھا۔

پھیلایئے نہ ہاتھ نہ دامن پساریئے
قسمت میں جو لکھا ہے وہ آئے گا ہاتھ میں

مگر اقبالؔ وجود کی معرفت رکھتے ہیں اور لکھتے ہیں:

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ
خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

اپنے اسی نظریہ کے لئے علامہ نے ایک اصطلاح قائم کی جسے ''خودی'' کا نام دیا۔ اب تک اردو ادب میں خودی کو 'انا' کے معنوں میں استعمال کیا جاتا رہا اور اس کے لئے منفی تصور رکھا گیا، مگر اقبالؔ نے خودی کو ایک الگ پہچان دی۔ اور 'خودی' کو خدا کی معرفت حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا۔ کہتے ہیں ؎

جس پاس خودی کا آسرا ہے
اس کے پاس خودی نہیں خدا ہے

اقبالؔ کی خودی فرسودہ فکر و خیال سے بغاوت تھی اور وحدت الوجود اور بے جا قناعت پسندی کے خلاف ایک ردعمل تھی۔ اقبالؔ نے زندگی کو ''صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے'' سے ہے تعبیر نہیں کیا بلکہ کہا ؎

رگوں میں گردش خوں ہے اگر تو کیا حاصل
حیات سوز جگر کے سوا کچھ اور نہیں

مسلسل کوشش کے سلسلے میں کہتے ہیں ؎

ہے فقط پیہم تلاش و جستجو میں زندگی
ہے فقط مضمر مسلسل آرزو میں زندگی

آرزو کو اپنے دل میں زندہ رکھ اے مرد کار
ورنہ بن جائے گی مشت خاک تیری اک مزار

اقبالؔ حقیقت سے آگاہ تھے اور اسلام اور قرآن کا بغور مطالعہ بھی کیا تھا اسی لئے کہتے ہیں ؎

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

آخر میں اقبالؔ کے ایک خط کا حصہ پیش ہے جس سے اقبالؔ کا تصوف کو لے کر کیا نظریہ تھا، واضح ہوتا ہے:

''حقیقی تصوف کا میں کیونکر مخالف ہو سکتا ہوں کہ خود سلسلۂ قادریہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں نے تصوف کو کراّت سے دیکھا ہے۔ بعض لوگوں نے ضرور غیر اسلامی عناصر اس میں داخل کر دیے ہیں جو شخص غیر اسلامی عناصر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے وہ تصوف کا خیر خواہ ہے نہ مخالف انہیں غیر اسلامی عناصر کی وجہ سے مغربی محققین نے تمام تصوف کو غیر اسلامی قرار دے دیا ہے اور یہ حملہ انھوں نے حقیقت میں مذہب اسلام پر کیا ہے۔''

(انوار اقبال۔ بشیر احمد ڈار۔ اقبال اکادمی، پاکستان۔ ص۔ ۱۸۱۔ خطوط بنام شاہ سلیمان پھلواری)

❑❑❑

خلیج

اسرار گاندھی

J/5

گلاب باڑی کالونی

الٰہ آباد

رابطہ: 9795126200

رات خاصی تاریک تھی۔اس تاریکی کو آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں نے اور بھی گہرا کر دیا تھا۔ ٹرین کی رفتار کافی تیز تھی۔

کھڑکی سے آتی ہوئی ہوا نے اس کے ہوش وحواس بجا کر رکھے تھے ورنہ حبس جان لیوا ثابت ہوتا۔وہ اس گرمی سے بھاگ کر ہی دارجلنگ کے لئے روانہ ہوا تھا۔

ایسا برسوں سے ہوتا آرہا تھا۔گرمیاں آتے ہی اس کے حواس باختہ ہونے لگتے اور تلوے کا تل اسے پریشان کرنے لگتا۔پھر وہ رختِ سفر باندھ لیتا۔شروع شروع میں ایک آدھ بار اس کی بیوی اور بچے بھی اس کے ساتھ گئے لیکن بعد کے برسوں میں نہ انھیں دارجلنگ جانے میں دلچسپی رہ گئی اور نہ اسے لے جانے میں۔

دارجلنگ اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔وہاں کا موسم، وہاں کے لوگ، خوبصورت مناظر، پہاڑوں کے نشیب وفراز، حسین چہرے اور خاص طرح کا ماحول اس کی روح میں کچھ اس طرح رچ بس گئے تھے کہ گرمی آتے ہی دارجلنگ اس کے خوابوں میں آنے لگتا اور یہ خواب اپنے ساتھ مسز ورما کو بھی لے آتے اور مسز ورما کے ساتھ بلّیو پائن کا ہونا ضروری تھا۔

بلیو پائن۔۔۔پرسکون جگہ پر بنا ہوا ایک بہت اچھا سا ہوٹل۔یہاں گرمیوں میں کمرے حاصل کرنا خاصا مشکل ہوتا۔شہر کے شور شرابے والی زندگی سے اکتائے ہوئے لوگ دارجلنگ آنے کے بعد سب سے پہلے بلّیو پائن میں ہی قسمت آزماتے۔

وہ برسوں سے یہیں ٹھہرتا آرہا تھا۔

مسز ورما کیا خوبصورت خاتون تھیں۔کھلتا ہوا گیہواں رنگ، بے حد تیکھے نقوش، چہرے پر بلا کی ملاحت، اتنی پرکشش کہ دیکھنے والا اس میں الجھ کر رہ جائے۔وہ کبھی انتہائی نرم نظر آتیں اور کبھی کوکونٹ کی طرح سخت۔خاصی تیز طرار واقع ہوئی تھیں۔

جو بات دل میں وہی زبان پر، کئی بار بلّیو پائن میں ٹھہرنے والے سیاح ان کے اس رویہ سے پریشان ہوجاتے اور اس ہوٹل میں کبھی نہ ٹھہرنے کی قسم کھا لیتے لیکن تھوڑی ہی دیر بعد مسز ورما کی ایک مسکراہٹ ان تمام قسم کھانے والوں کے گلے شکوے دور کر دیتی۔

ان کی عمر یہی کوئی پینتیس چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔لیکن دیکھنے میں تیس سال سے زیادہ کی نہ لگتیں تھیں۔ پہلے پہل اسے خیال گزرا تھا کہ وہ اور مسز ورما ہم عمر ہوں گے لیکن گزرتے ہوئے دنوں نے اسے بتایا تھا کہ وہ مسز ورما سے کئی برس چھوٹا ہے۔شاید مسز ورما کو بھی اس کا اندازہ ہو چلا تھا۔

وہ دارجلنگ میں بڑی اسناب (Snob) سمجھی جاتی تھیں کہ مقامی لوگوں سے ہمیشہ ایک فاصلہ بنا کر ملتیں۔

برسوں پہلے مسز ورما کے رویے اس کے ساتھ بھی ایسے ہی ہوتے تھے جیسے دوسرے سیاحوں کے ساتھ ہوا کرتے۔لیکن وہ دھیرے دھیرے اس سے مانوس ہوتی گئی تھیں۔ پھر اس کے ساتھ ان کا رویہ قطعی پروفیشنل نہیں رہ گیا تھا۔اس کی حیثیت دوست جیسی ہو گئی تھی۔وہ ان کے اندر ہونے والی اس تبدیلی کو بڑی شدت سے محسوس کرتا لیکن اسے کوئی نام نہ دے پاتا۔

ادھر چند برسوں سے وہ جب دارجلنگ پہنچتا تو مسز ورما اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ایسی گرم جوشی سے اس کا استقبال کرتیں کہ اس کا پورا وجود تمتما اٹھتا۔وہ اس کے لئے ایک ایسا کمرہ رکھ چھوڑتیں جو ان کے اپنے ذاتی کمروں کے قریب ہوتا۔ وہ جب چاہتیں اسے بلا لیتیں یا پھر خود ہی اس کے کمرے میں چلی جاتیں اور شروع ہو جاتا طرح طرح کی باتوں کا سلسلہ۔

صبح کی چائے وہ عموماً ان کے ساتھ ہی پیتا۔نہ جانے کیوں اسے مسز ورما کے ساتھ لان پر بیٹھ کر چائے پینا بہت اچھا لگتا۔وہ اگر اچھے موڈ میں ہوتیں تو صبح کچھ زیادہ ہی روشن محسوس ہونے لگتی۔اپنی باتوں سے وہ اسے خوب ہنساتیں اور خود بھی ہنستیں۔ہاں اگر ان کا موڈ مختلف ہوتا تو پھر خاموش ہی رہتیں۔اسے اس خاموشی سے بڑی چبھن محسوس ہوتی لیکن وہ بھی چپ ہی رہتا کہ نہ معلوم اس کی کون سی بات انھیں اچھی نہ لگے اور وہ بگڑ جائیں ایک بار اس کو اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔

اسے یاد آیا کہ اس دن بھی وہ اچھے موڈ میں نہیں تھیں۔اس نے انھیں چھیڑنے کی غرض سے بلیو پائن میں ٹھہری ہوئی ایک غیر ملکی سیاح لڑکی کی خوبصورتی کا ذکر کچھ زیادہ ہی کر دیا تھا اور وہ ابل پڑی تھیں۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق نہیں ہے۔تمھارے لئے بھی عورت کسی چٹپٹی چیز سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، تمھیں شرم آنی چاہئے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمھیں دوسروں سے الگ سمجھا۔''

پھر وہ پیر پٹختے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

وہ ہکا بکا ہو کر انھیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

اسے ان کے اس رویہ پر شدید دھکا لگا تھا۔وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مذاق میں کہی گئی بات اس طرح کا رخ اختیار کر لے گی۔

کچھ دیر بعد اس نے اپنے کمرے کے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنی تھی۔ ایک جانی پہچانی سی آہٹ۔مسز ورما اس کے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔وہ اس کے بالکل قریب آ کر کھڑی ہو گئیں۔ ان کے چہرے پر خجالت کے آثار تھے۔

''ویری سوری'' وہ شرمسار سے لہجے میں بولیں۔پھر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ اس نے مسز ورما کے نرم نرم ہاتھوں میں خاصی گرمی محسوس کی اس نے انکی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا لیکن ایسا کچھ نہ تھا جسے کوئی نام دیا جا سکتا۔اسے قدرے مایوسی ہوئی۔

''کوئی بات نہیں مسز ورما یہ سب بھی چلتا ہے۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

''نہیں واقعی مجھے اپنے رویہ پر افسوس ہے۔میں خود بھی نہیں سمجھ سکتی کہ اچانک مجھے کیا ہو جاتا ہے۔'' وہ اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے آہستہ سے بولیں۔

چند لمحے کے لئے خاموشی چھا گئی۔

''چلو ٹی گارڈن کی طرف چلتے ہیں۔تمھارا موڈ فریش ہو جائے گا۔''

پھر وہ اسی طرف چلے گئے۔

مسز ورما کے ساتھ اسے اس طرح کبھی کبھی گھومنا ہمیشہ اچھا لگا۔

ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ کسی اسٹیشن پر رکی تو اس کی سوچ کو بھی جھٹکا لگا۔وہ منتشر ہو گئی لیکن ٹرین کے دوبارہ چلتے ہی وہ پھر یکجا ہو کر اس کے وجود پر منڈرانے لگی۔

اسے پچھلے برس سے پچھلے کی گرمیاں یاد آ گئیں۔

وہ اس صبح چائے کی میز پر قدرے دیر سے پہنچا تھا۔

''کتنا سوتے ہو'' وہ اسے دیکھ کر بولیں۔

''سوری مسز ورما دراصل رات مجھے نیند کم آئی اس لئے سو کر ذرا دیر سے اٹھا۔''

''نیند کم کیوں آئی؟''

''کہہ نہیں سکتا کیا وجہ تھی۔''

''میں دیر سے تمھارا انتظار کر رہی تھی۔''

''شکریہ مسز ورما۔''

''شکریے کی کوئی بات نہیں۔تمھیں شاید نہیں معلوم کہ میں گرمیوں کے انتظار میں پورا سال کس طرح بے چینی سے گزارتی ہوں۔ دراصل یہاں تمھاری موجودگی میرے لئے سکون کا باعث ہوتی ہے۔''

مسز ورما ایک لمبی سانس لیتے ہوئے آہستہ سے بولیں۔

اس نے ان کی بات کو بڑی خاموشی سے سنا۔ اپنے اندر اس نے ایک ہلکی سی اتھل پتھل محسوس کی۔

اس کی آنکھوں نے مسز ورما کی آنکھوں میں کچھ ایسی کیفیت تلاش کرنے کی کوشش کی جسے کوئی نام دیا جا سکے ۔ اسے ان کی آنکھوں میں رنگین لہریے سے گزرتے ہوئے محسوس ہوئے ۔ اگلے لمحے وہاں ایسا کچھ نہ تھا جسے کوئی نام دیا جا سکتا۔ اس نے سوچا کہ یہ لہریے شاید اس کا واہمہ رہے ہوں گے۔ وہ قدرے اداس ہوگیا۔

اس کی اداسی سے بےخبر مسز ورما پھر بولیں ''نہ جانے کیوں مجھے تمھاری موجودگی ایک ایسا احساس دیتی ہے جسے میں بتا نہیں سکتی۔''

وہ خاموش رہا۔ اس کی نظریں سامنے والے نشیب میں چکر لگاتی پھر رہی تھیں۔

''کہاں کھو گئے؟'' وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

''اوہ!'' اس نے ایک طویل سانس لی پھر دھیرے سے بولا۔ ''کہیں بھی نہیں۔''

''جانتے ہو ہریش کے جانے کے بعد میں کتنا پریشان رہی۔ تم شاید اس کا اندازہ بھی نہ کرسکو۔ لیکن میں اب اس ذہنی کیفیت سے باہر آ چکی ہوں۔ Thanks to you۔''

اسے مسز ورما کی بات سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ خود ہی اپنے شوہر ہریش کا ذکر کر رہی تھیں۔ ورنہ وہ تو ہریش کا ذکر آتے ہی جھنجھلا جاتیں۔ اسے یاد آیا کہ ایک بار ان کے ہوٹل میں ٹھہرنے والے ایک سیاح نے ان سے ان کے شوہر کے بارے میں پوچھ لیا تھا اور وہ اس سیاح پر اتنا بگڑی تھیں کہ اسے بلیو پائن سے نکال کر ہی دم لیا تھا۔

''مجھ کو بڑا تعجب ہے کہ تم نے کبھی ہریش کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی۔'' وہ اسے خاموش دیکھ کر بولیں۔

''میں نے کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں یوں بھی کسی کی ذاتی زندگی میں جھانکنے سے پرہیز کرتا ہوں۔''

تھوڑی دیر کے لئے سناٹا چھا گیا۔

''مجھے گزرا ہوا وقت یاد آ رہا ہے۔ میں ان لمحوں کو تمھارے ساتھ Share کرنا چاہتی ہوں۔''

''مجھے بہت خوشی ہوگی۔'' وہ مسز ورما کو غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

مسز ورما نے ایک لمبی سی سانس لی، پھر آہستہ سے بولیں ''ہریش سے میری پہلی ملاقات کلکتہ میں ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔''

''کلکتہ میں۔۔۔۔؟'' اس نے ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی سوال کر دیا۔

''ہاں کلکتہ میں۔ میرے پاپا چاہتے تھے کہ میں اچھی تعلیم حاصل کروں۔ اسی لئے انھوں نے مجھے وہاں بچپن سے ہی بھیج دیا تھا۔ میں نے اپنی زندگی کا ایک اچھا خاصا حصہ ہاسٹل میں رہ کر گزارا ہے۔ کیا دن تھے وہ بھی۔ ہر طرح کی آزادی، ہر طرح کا آرام۔ میں ہمیشہ سے ہی تیز طرار اور شوخ تھی۔ یہ شوخی اس وقت بھی قائم رہی کہ جب میں کالج سے نکل کر یونیورسٹی پہنچ گئی۔ دن بھر ساتھیوں سے چھیڑ چھاڑ رہتی۔ کبھی یہ نشانے پر ہوتا کبھی وہ۔ میں اپنی انھیں شوخیوں کی وجہ سے بہت جلد یونیورسٹی میں ایک جانی پہچانی شخصیت بن گئی۔ میں اپنی کلاس ختم کرنے کے بعد ساتھی لڑکیوں کے ساتھ یونیورسٹی کیمپس میں ٹہلنے نکل پڑتی۔ پھر کسی نہ کسی لڑکے کو بکرا بننا ہی پڑتا۔ بس ایک کپ کافی اور معمولی سے اسنیکس پر اکتفا کر لیا جاتا تھا کہ اسے آئندہ بھی گھیرا جا سکے۔ انھیں دنوں کئی لڑکے میری جانب سنجیدگی سے متوجہ ہوئے۔ لیکن میرے رویوں سے وہ جلد ہی اپنی دنیا میں واپس لوٹ گئے۔ کہاں میں اور کہاں سنجیدگی۔''

مسز ورما سانس لینے کے لئے ذرا ٹھہر گئیں۔ اسے لگا کہ جیسے ان کی آنکھیں ماضی میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

''مسز ورما وہ ہریش۔۔۔۔۔۔ آپ نے اپنی بات پوری نہیں کی۔''

''ہاں میں اسی طرف آ رہی ہوں۔ ہریش میرا کلاس فیلو تھا میں نے شروع سے ہی محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ سے دور دور رہتا ہے۔ بس یہی بات میرے اندرونِ جاں میں کہیں چبھ گئی۔ میں نے طے کر لیا کہ ہریش کو اس کی اوقات بتائے بغیر نہیں رہوں گی۔ پھر اس کی اوقات بتانے کے چکر میں کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ میں محسوس کرنے لگی تھی کہ میں اب ہریش کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس کے رویے بھی بدل گئے تھے۔ وہ اپنے وقت کا زیادہ حصہ میرے ساتھ ہی گزارتا۔ میرا چنچل پن نہ جانے کہاں چلا گیا تھا اور اس تبدیلی کو میرے تمام ساتھی محسوس کرنے لگے تھے۔ پھر ایک دن سات پھیروں کے بعد ہریش اور میں ایک ہی چھت کے نیچے رہنے کے لئے آ گئے۔''

''شروع کے دن بہت اچھے گزرے۔ میں ہوتی ہریش ہوتا اور یہاں کی خوبصورت وادیاں ہوتیں۔ لیکن دو تین برسوں کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ ہریش کی دلچسپیاں مجھ سے زیادہ دوسری عورتوں میں بڑھ گئی ہیں۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتی لیکن وہ میری بات سمجھنے کے بجائے لڑائی جھگڑے پر آمادہ ہو جاتا۔ پھر اس دن حد ہی ہوگئی جب میں نے اسے ایک نوکرانی سے فلرٹ کرتے ہوئے اپنی نظروں سے دیکھا۔ میں نے اسے یہاں سے چلے جانے کو کہا اور وہ سچ مچ چلا گیا۔ کبھی نہ آنے کے لئے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ دارجلنگ چھوڑتے وقت وہ اپنے ساتھ کسی عورت کو بھی لے گیا۔''

''اوہ!'' میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''اور پھر برسوں بعد میں آنے والی گرمیوں کا انتظار کرنے لگی۔'' وہ اپنی گہری گہری آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولیں۔

ان کی آواز میں نہ جانے کیا تھا کہ اسے اپنے

اندر ایک لہر سی اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے ان کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ اسے پھر وہاں ویسے ہی رنگین لہریے گزرتے ہوئے نظر آئے۔ جس طرح کے لہرئے وہ پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا اور انھیں اپنا واہمہ سمجھا تھا۔

مسز ورما کی آنکھوں سے وہ رنگین لہریے پھر غائب ہو چکے تھے اور ان کی جگہ ایک ایسے سونے پن نے لے لی تھی جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اور وہ ایک بار پھر اداس ہو گیا۔

''چلو گھوم آئیں'' وہ اسے خاموش دیکھ کر بولیں۔

''کہاں؟''

''کہیں بھی چل سکتے ہیں۔''

''اچھا میں تیار ہو کر آتا ہوں'' وہ اٹھا اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ تیار ہو کر نکلا تو دیکھا کہ مسز ورما اس کے انتظار میں لان پر بیٹھی ہیں۔

وہ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئیں پھر کار پر بیٹھتی ہوئی بولیں۔

''چلو راک گارڈن چلتے ہیں۔ تم میرے ساتھ وہاں پہلے کبھی نہیں گئے۔''

''چلئے'' وہ مسز ورما کے بغل میں بیٹھتا ہوا بولا۔ اسے معلوم تھا کہ راک گارڈن مسز ورما کی کمزوری ہے۔

انھوں نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی اور اسے دیکھتے ہوئے بولیں۔

''یہ کار میرے پاپا نے مجھے شادی کے موقع پر تحفتاً دی تھی۔ کتنے اچھے تھے وہ۔ مجھے بے پناہ چاہتے تھے۔ میری تمام خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی جو اب امریکہ میں رہتا ہے، اس بات پر پاپا سے خوب لڑتا تھا، وہی بھائی اب اگر روز فون پر بات نہ کر لے تو شاید اس کا کھانا ہضم نہ ہو۔''

مسز ورما کار خاصی تیز رفتار سے چلا رہی تھیں۔ دارجلنگ کے راک گارڈن کا راستہ یوں بھی کافی پر پیچ ہے۔ اتار چڑھاؤ بھی بہت خطرناک، ذرا سی لغزش ہزاروں فٹ نیچے لے جا سکتی تھی۔

اسے ڈر سا محسوس ہوا۔ اس نے اپنی آنکھیں نشیب کی جانب سے ہٹا لیں اور مسز ورما سے بولا ''میڈم آپ کافی خطرناک ڈرائیو کر رہی ہیں۔ مرنے کی اتنی بھی کیا جلدی ہے؟''

وہ ہنستے ہوئے بولیں ''مجھے تیز کار چلانے میں بہت مزہ آتا ہے اور اگر کسی حادثے میں مر گئے تو اس طرح سے مرنے کا اپنا ایک الگ رومانس ہوگا۔ ویسے کیا تم ڈر رہے ہو؟''

''بالکل نہیں۔ مجھے بھی آپ کے ساتھ اس رومانس میں شرکت کر کے اچھا لگے گا'' وہ بھی ہنستا ہوا بولا۔

مسز ورما نے ایک لمحے کے لئے ونڈ اسکرین سے اپنی آنکھیں ہٹائیں اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں ایسا کچھ بھی نہ تھا جسے کوئی نام دیا جا سکتا۔ وہ قدرے اداس ہو گئیں۔

''مسز ورما جب میں لگاتار شدید ذہنی الجھنوں کا سامنا کرتے کرتے تھک جاتا ہوں تو زندگی کی سچائیوں سے فرار حاصل کرنے کے لئے یہاں آ جاتا ہوں۔ پھر آپ کی موجودگی سے وہ الجھنیں اس قدر خوف زدہ ہو جاتی ہیں کہ میرے قریب بھی نہیں پھٹکتیں۔''

''کیسی الجھنیں؟''

''گھریلو''

''کیا میں ان الجھنوں کو جان سکتی ہوں؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں؟ میں آپ کو بتاتا ہوں'' وہ سانس لینے کے لئے رکا۔ اس کی آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کیں تو شکنیں پیشانی پر آ کر بیٹھ گئیں۔ ایسا لگا کہ جیسے وہ ڈور کے اس سرے کی تلاش میں ہو کہ جہاں سے وہ اپنی بات شروع کر سکے۔ چند لمحوں کے بعد وہ مدھم سی آواز میں بولا۔

''میری شادی میں میرے ماں باپ کی رضا مندی پوری طرح سے شامل نہیں تھی۔ لیکن میری خوشیوں کے لئے انھوں نے میری اس خواہش کو قبول کر لیا۔ دراصل وہ ڈرتے تھے کہ خاندان کے باہر سے آنے والی لڑکی شاید ان کا وہ خیال نہ رکھ سکے جس کے وہ مستحق تھے۔ ان کا یہ خوف فطری بھی تھا کہ ایک کالج میں پڑھانے کی وجہ سے اس کے پاس وقت کی اتنی کمی تھی کہ میرے والدین کی کون کہے، مجھے بھی اس سے جتنا وقت درکار تھا، نہیں دے پاتی تھی۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ رات جب میں دوستوں کی محفل سے واپس آتا تو وہ سو چکی ہوتی اور جب میں اسے کھانے کے لئے جگاتا تو چڑھ جاتی اور پھر تو تو میں میں شروع ہو جاتی۔ میں محسوس کرتا کہ میرے والدین اس صورت حال سے رنجیدہ رہنے لگے تھے۔ میں انھیں سمجھانے کی کوشش کرتا لیکن مایوسی ہاتھ لگتی۔ ان کے گلے شکوے بے جا نہیں تھے۔ انھوں نے اپنی بہو کو لے کر جو خواب دیکھے تھے وہ بکھر چکے تھے۔ میں خود بھی ان حالات سے پریشان تھا۔ انھوں نے بڑی پریشانیوں سے میری پرورش کی تھی۔''

وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا اس کی آنکھوں سے اداسی ٹپک رہی تھی۔

مسز ورما بے چین سی ہو گئیں۔ انھوں نے اپنا بایاں ہاتھ اسٹیرنگ پر سے ہٹایا اور اس کی پیٹھ تھپتھپاتی ہوئی بھاری بھاری سی آواز میں بولیں ''پھر کیا ہوا؟''

''پھر میرے ماں اور باپ دونوں ہی ہارٹ اٹیک کا شکار ہو کر اس دنیا سے چلے گئے۔ دونوں کے جانے کا درمیانی وقفہ بہت کم تھا۔ وہ چلے گئے لیکن میرے دل میں ایک ایسی چبھن چھوڑ گئے جو شاید کبھی

ختم نہ ہو۔ پھر میرے اور بیوی کے بیچ انا در آئی اور دھیرے دھیرے ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے ایک ہی چھت کے نیچے رہنے کے باوجود اجنبی ہو کر رہ گئے۔ اور اب ہم دونوں کے درمیان بچّے ایک پل کا کام کر رہے ہیں۔'' وہ پھر چپ ہو گیا۔

''تم اس سے اپنا پیچھا کیوں نہیں چھڑا لیتے؟'' مسز ورما نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک سپاٹ سا سوال کر دیا۔

مسز ورما بس یہی تو نہیں ہو سکتا۔ میں اگر اپنا پیچھا چھڑا لوں تو پھر بچوں کا کیا ہوگا؟ ان کا مستقبل۔۔۔؟ نہیں مسز ورما! میں اپنے بچّوں کے مستقبل کی قیمت پر اپنی خوشیاں حاصل کرنا کبھی پسند نہ کروں گا۔ وہ شاید بچّے ہی ہیں جو زیادہ تر گھروں کو پوری طرح سے ٹوٹ کر بکھرنے سے بچائے ہوئے ہیں۔ ہر کسی میں آپ جیسی ہمت کہاں؟''

مسز ورما نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا تو دونوں کی نظریں ملیں اور دونوں کے چہروں پر ایک بے نام سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

راک گارڈن گھومتے وقت وہ کئی بار اداس ہوئیں کہ جب بھی انھوں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا، وہاں ایسا کچھ بھی نہ تھا جسے کوئی نام دیا جا سکتا۔

راک گارڈن سے واپسی پر انھیں خاصی دیر ہو گئی تھی۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا اور اس اندھیرے میں دور تک پھیلے ہوئے پہاڑوں کا سلسلہ اسے کسی عفریت جیسا لگ رہا تھا۔ مسز ورما بڑی مشّاقی سے کار چلا رہی تھیں۔ وہ کبھی کبھی کسی موڑ پر جب اچانک بھرپور بریک کا استعمال کرتیں تو اس کا جسم ان سے ٹکرا جاتا اور ایک عجیب سی کیفیت بیدار ہونے لگتی۔

وہ جب بلّیو پائن پہنچے تو رات کوئی نو بج رہے تھے۔ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے اسے اس کے کمرے تک پہنچانے آئیں۔ رخصت ہوتے وقت دونوں نے ایک بار پھر ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا انھیں وہاں دھنک کے رنگ لہراتے ہوئے نظر آئے۔ وہاں کچھ نہ تھا جسے کوئی نام دیا جا سکتا۔ صرف ایک چمک تھی۔ سراب جیسی چمک۔

وہاں ایک گہری خاموشی پسر گئی۔ پھر اس خاموشی کو مسز ورما کی چاپ نے توڑا۔ وہ کشاں کشاں اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔

اسے یاد آیا کہ آخری بار جب وہ دارجلنگ سے واپس لوٹ رہا تھا تو مسز ورما اسے الوداع کہنے نیو جلپائی گڑی تک اس کے ساتھ آئی تھیں۔ اس نے انھیں روکا بھی تھا، لیکن انھوں نے یہ کہہ کر اسے خاموش کر دیا تھا کہ انھیں وہاں کوئی ضروری کام ہے۔

انھوں نے ٹرین چھوٹنے سے پہلے اس سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر کہا تھا :

''اگلے Summer میں پھر ملتے ہیں۔''

اور ٹرین کو نظروں سے اوجھل ہونے تک اپنے ہاتھ ہلاتی رہی تھیں۔

پھر وہ پچھلی گرمیوں میں دارجلنگ نہیں جا سکا تھا۔ انجینئرنگ میں بیٹے کے داخلے کے لئے بھاگ دوڑ اور لگاتار الجھنوں میں رہنے کے باعث خود اس کی اپنی گرتی ہوئی صحت دارجلنگ کی راہ میں روڑا بن گئے تھے۔ اسے پتہ تھا کہ مسز ورما کو ساری گرمی اس کا انتظار بڑی بے چینی سے رہا ہوگا۔ وہ ان سے فون پر بھی رابطہ نہیں قائم کر سکا تھا کہ ان دونوں کے درمیان فون کرنے کی کوئی روایت نہیں تھی۔

وہ یہ سب سوچ سوچ کے نہ جانے کب سو گیا پھر اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ اور مسز ورما ایک ہرے بھرے پہاڑ پر دوڑ رہے ہیں۔ اس دوڑ میں مسز ورما آگے ہیں اور وہ پیچھے۔ وہ انھیں پا لینا چاہتا ہے لیکن وہ ان کے ہاتھ آتے آتے رہ جاتی ہیں۔ اس بھاگ دوڑ میں اچانک اس کے پیر پھسل جاتے ہیں اور وہ کوشش کے باوجود خود کو نہیں سنبھال پاتا۔ وہ تیزی سے ہزاروں فٹ گہری کھائی میں جا رہا ہے، وہ چیخنا چاہتا ہے لیکن آواز گلے میں گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ موت سرعت سے قریب آ رہی ہے۔ اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا ہے۔

پھر وہ جاگ گیا۔ لیکن وہ پوری طرح سے جاگا بھی تو نہیں تھا۔ سونے جاگنے کی درمیانی کیفیت۔ وہ پوری طرح سے ہوش میں آنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کے ہاتھ پیر تو جیسے جم گئے تھے۔ اسے بے حد گھبراہٹ ہونے لگی۔ اسے لگا کہ جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ پھر اچانک وہ جاگ گیا اور اسے اس اذیت سے نجات مل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا دل اب بھی بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ ڈبے میں حبس پوری طرح سے براجمان ہے۔

اس نے تھرمس سے پانی نکال کر پیا تو اسے قدرے سکون محسوس ہوا۔ پھر گھڑی دیکھی تو چار بج رہے تھے۔ ابھی کئی گھنٹے کا سفر باقی تھا۔ اس نے ڈبہ کے باہر دیکھا تو صبح کاذب کے آثار ہویدا تھے۔ وہ پھر لیٹ گیا اور کھڑکی سے آتی ہوئی ٹھنڈی ہوا نے اسے تھپک تھپک کر دوبارہ سلا دیا۔

اس کے بعد اس کی آنکھیں نیو جلپائی گڑی کے اسٹیشن کے Outer پر ہی کھلیں۔ لوگ اپنا اپنا سامان اکٹھا کر کے اترنے کی تیاری کر رہے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا اور اپنا سامان برتھ کے نیچے سے نکال کر اکٹھا کرنے لگا۔

کوئی ڈھائی گھنٹے بعد دارجلنگ میں اس کے قدم آہستہ آہستہ بلّیو پائن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ جب بلّیو پائن پہنچا تو اسے ایک عجیب سے سناٹے کا احساس ہوا۔ اسے دیکھتے ہی رسیپشن کلرک اجمل تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

''ہلو کیسے ہیں آپ؟'' اجمل اس کے قریب آ کر بولا۔

''میں ٹھیک ہوں اور تم؟''

''میں بھی بس ٹھیک ہی ہوں۔'' اس کے لہجے

میں ایک بے نام سی اداسی تھی۔

''مسز ورما کیسی ہیں؟''

اجمل خاموش رہا۔اس کے چہرے پر بے چینی کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔

''میں نے تم سے کچھ پوچھا؟'' اس نے اجمل کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پھر سوال کیا۔

'' میڈم نہیں رہیں۔'' اجمل نے ٹھہر ٹھہر کر جواب دیا۔

''کیا بکتے ہو؟'' وہ اتنی تیزی سے اچھلا کہ جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

''یہ سچ ہے۔'' اجمل کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

اسے لگا کہ جیسے بلّیو پائن آہستہ آہستہ دھنس رہا ہو۔پھر وہ اگر قریب رکھی ہوئی کرسی پر نہ بیٹھ جاتا تو یقیناً چکرا کر گر پڑتا۔

اجمل نے کسی نوکر کو آواز دے کر پانی منگایا اور اس کی بغل والی کرسی پر خود بھی بیٹھ گیا۔

ایک گلاس پانی نے اس کے حواس کسی قدر یکجا کئے۔

''یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟'' اس نے سونی سونی آنکھوں سے اجمل کی طرف دیکھ کر پوچھا تھا۔

''کیا بتاؤں آپ کو۔آپ تو جانتے ہی ہیں کہ گرمیاں شروع ہوتے ہی وہ آپ کا انتظار کرنے لگتی تھیں۔پچھلی گرمیوں میں بھی ایسا ہی ہوا۔لیکن آپ نہیں آئے۔ وہ ساری گرمی بے حد بے چینی میں مبتلا رہیں۔مجھ سے بار بار کہتیں کہ آپ کسی اور ہوٹل میں نہ رک گئے ہوں۔ انھوں نے مجھے کئی بار آپ کو ڈھونڈنے کے لئے دوسرے ہوٹلوں میں بھیجا بھی۔ میں ان کی اس بے چینی کو دیکھ کر خود بھی پریشان ہو اٹھتا۔وہ ذہنی طور پر لگاتار پریشان رہنے لگی تھیں۔وہ برابر آپ کا ذکر کرتی رہتیں۔ان کے مزاج میں اچھا خاصا چڑچڑا پن پیدا ہو گیا تھا۔ذرا ذرا سی بات پر چیخنے چلّانے لگتیں۔ہوٹل کے تمام ملازم جوان کا بہت خیال

مسز ورما نے ایک لمحے کے لئے ونڈ اسکرین سے اپنی آنکھیں ہٹائیں اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔وہاں ایسا کچھ بھی نہ تھا جسے کوئی نام دیا جا سکتا۔وہ قدرے اداس ہو گئیں۔

'' مسز ورما جب میں لگاتار شدید ذہنی الجھنوں کا سامنا کرتے کرتے تھک جاتا ہوں تو زندگی کی سچائیوں سے فرار حاصل کرنے کے لئے یہاں آ جاتا ہوں۔پھر آپ کی موجودگی سے وہ الجھنیں اس قدر خوف زدہ ہو جاتی ہیں کہ میرے قریب بھی نہیں پھٹکتیں۔''

''کیسی الجھنیں؟''

''گھریلو''

''کیا میں ان الجھنوں کو جان سکتی ہوں؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں؟ میں آپ کو بتاتا ہوں'' وہ سانس لینے کے لئے رکا۔اس کی آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کیں تو شکنیں پیشانی پر آ کر بیٹھ گئیں۔ایسا لگا کہ جیسے وہ ڈور کے اس سرے کی تلاش میں ہو کہ جہاں سے وہ اپنی بات شروع کر سکے۔چند لمحوں کے بعد وہ مدھم سی آواز میں بولا۔

''میری شادی میں میرے ماں باپ کی رضا مندی پوری طرح سے شامل نہیں تھی۔لیکن میری خوشیوں کے لئے انھوں نے میری اس خواہش کو قبول کر لیا۔دراصل وہ ڈرتے تھے کہ خاندان کے باہر سے آنے والی لڑکی شاید ان کا وہ خیال نہ رکھ سکے جس کے وہ مستحق تھے۔ان کا یہ خوف فطری بھی تھا کہ ایک کالج میں پڑھانے کی وجہ سے اس کے پاس وقت کی اتنی کمی تھی کہ میرے والدین کی کون کہے، مجھے بھی اس سے جتنا وقت درکار تھا،نہیں دے پاتی تھی۔کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ رات جب میں دوستوں کی محفل سے واپس آتا تو وہ سو چکی ہوتی اور جب میں اسے کھانے کے لئے جگاتا تو چڑھ جاتی اور پھر تو تو میں میں شروع ہو جاتی۔

رکھتے تھے، ان سے کترانے لگے۔ پھر سردیاں آ گئیں۔سردیوں میں ہوٹل کا کاروبار بندسا ہو جاتا ہے۔اس طرح ان کی مشغولیت ختم سی ہو گئی۔وہ شدید تنہائی کا شکار ہو گئیں۔پھر ایک دن ان پر نروس بریک ڈاؤن کا حملہ ہوا وہ بے حد بیمار پڑ گئیں۔چند دنوں بعد امریکہ سے ان کا بھائی آ گیا۔اس نے بڑی کوشش کی کہ میڈم کچھ دنوں کے لئے ان کے ساتھ امریکہ چلی جائیں لیکن وہ کسی طرح سے راضی نہ ہوئیں۔وہ بہت ضدی ہو گئی تھیں۔آہستہ آہستہ ان کی حالت ٹھیک ہونے لگی۔خاصا مہنگا علاج ہو رہا تھا۔بھرپور طریقہ سے ان کی دیکھ ریکھ بھی ہو رہی تھی۔کوئی دو مہینے بعد ان کا بھائی امریکہ واپس چلا گیا۔جاتے وقت وہ ہم لوگوں کو ہدایت دے گیا تھا کہ میڈم کو کار نہ چلانے دیا جائے۔شاید اس لئے کہ ان کا نروس سسٹم بہت کمزور ہو گیا تھا۔

ایک دن صبح جب میں ڈیوٹی پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ میڈم اپنی کار خود چلا کر راک گارڈن کی طرف گئی ہیں۔میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔وہ ابھی پوری طرح صحت مند نہیں ہوئی تھیں۔ میں نے ان کے خیریت سے واپس آنے کے لئے دعا کی۔لیکن شاید دعا کرنے میں مجھے کچھ دیر ہو گئی تھی۔چند گھنٹوں بعد پتہ چلا کہ ان کی کار ان کے قابو سے باہر ہو کر ہزاروں فٹ گہری کھائی کا نوالہ بن گئی ہے۔''

اجمل خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔وہ سکتے کے سے عالم میں خالی خالی آنکھوں سے اسے گھورے جا رہا تھا، پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔اسے محسوس ہوا کہ جیسے ریسپشن روم تیزی سے گردش کر رہا ہو۔اس نے اپنا سر قریب رکھی ہوئی میز پر ٹکا دیا۔

اور جب اس نے اپنی آنکھیں پھر کھولیں تو بلّیو پائن کے دھنک رنگ غائب ہو چکے تھے،اور وہاں ایسا کچھ بھی نہ تھا جسے کوئی نام دیا جا سکتا۔

❑❑❑

کہانی کی تلاش

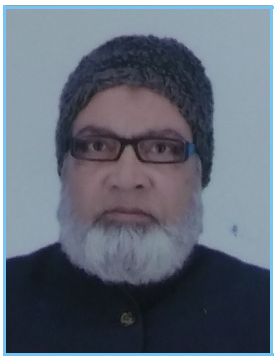

عبیداللہ چودھری

313

بسنت پور

گورکھپور

رابطہ: 9235895921

اردو فکشن سے تعلق رکھنے والے افراد مجھے افسانہ نگار کہتے ہیں تاہم میں خود کو افسانہ نگار نہیں مانتا، میں تو اردو فکشن کا ایک ادنیٰ سا نقاد ہوں اس کے علاوہ کچھ نہیں، جہاں تک افسانہ نگاری کا تعلق ہے تو یہ سمجھ لیجئے کہ جب بھی میں کہانی لکھنے کے لئے موڈ بناتا ہوں، یعنی خود کو تیار کرتا ہوں تو کوئی نہ کوئی کام اس عمل کو کرنے کے لئے حائل ہو جاتا ہے، میں جب کسی واقعہ کو ذہن میں محفوظ کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ جب فرصت کے لمحات میسر ہوں گے تو اس واقعہ کو افسانوی رنگ دے کر اپنے ذہن کی تسکین کر لوں گا کہانی لکھنے سے زیادہ مجھے کہانی پڑھنے کا شوق ہے، میں کہانی پہلے پڑھتا ہوں اور کہانی کار کا نام بعد میں دیکھتا ہوں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی معروف جریدے میں غیر معروف افسانہ نگار کی کہانی پسند آجاتی ہے تو میں فوراً موبائیل نمبر دیکھ کر بذریعہ فون افسانہ نگار کو مبارکباد دیتا ہوں اور اس کے حوصلہ افزائی کے سلسلے میں ہر ممکن مدد کا وعدہ بھی کرتا ہوں کہانی کی تلاش میں کبھی کبھی سفر کی صعوبتیں بھی برداشت کرتا ہوں میرے پنجاب کے دو دوست افسانہ نگار (جواب آنجہانی ہو چکے ہیں۔)

ہیرانند سوز اور اوم کرشن راحت کہا کرتے تھے ''بھئی چودھری جی اچھی کہانی لکھنا ہو تو زیادہ سے زیادہ سفر کیا کرو'' مجھے ان کی یہ بات اس وقت عجیب سی لگتی تھی، تاہم جب میں نے جوگندر پال جی کے مضمون میں یہ پڑھا کہ اچھی کہانی لکھنے کے لئے دل و دماغ کو سکون اور یکسوئی کے ساتھ دیگر تفکرات سے خود کو آزاد اور پاک کرنا پڑتا ہے، 1986ء سے 1996ء تک معروف افسانہ نگار رام لعل صاحب کا ساتھ رہا، 1986ء میں ہی ریسرچ میں میرا رجسٹریشن بھاگل پور یونیورسٹی میں ہو گیا میرے تحقیقی مقالہ کا عنوان تھا۔ اتر پردیش میں اردو افسانہ 1960ء کے بعد میرے نگراں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی صاحب بنائے گئے اس زمانے میں بھاگل پور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر مظفر اقبال صاحب تھے، تحقیقی مقالہ کی تکمیل کے ضمن میں خاکسار کو اتر پردیش کے افسانہ نگاروں کی تفصیلات اور ان کے کوائف جمع کرنے کے لئے در در بھٹکنا پڑا۔

خدا خدا کر کے مجھے 1991ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کر دی گئی تحقیقی مقالہ کے مکمل کرانے میں ڈاکٹر بشیشر، پردیپ صاحب، رام لعل صاحب اور عابد سہیل صاحب نے میرا بھرپور تعاون کیا اس اعتبار سے وہ تینوں ہی حضرات میرے کرم فرما اور محسن ہی تھے۔

ان تینوں شخصیات کو میرا قلم مرحوم لکھنا پسند نہیں کر رہا ہے کیونکہ ان افسانہ نگاروں کا ساتھ ان کی زندگی کے آخری وقت تک رہا، تینوں تین قسم کے افسانہ نگار تھے رام لعل جی کی کہانیاں ریلوے کی ملازمت کی وجہ سے محکمہ ریلوے کی زندگی سے متعلق ہوا کرتی تھیں۔

بقول احمد جمال پاشا ''رام لعل کے افسانے ریلوے پلیٹ فارم سے شروع ہو کر کسی آخری اسٹیشن پر جا کر ختم ہو جاتے ہیں، اب لیجئے یہاں پر احمد جمال پاشا کا ذکر کہاں سے آ گیا، یہ 1979ء کی بات ہے راقم الحروف صوبۂ بہار میں سیوان سے 16/کلومیٹر کی دوری پر ساہوجین ہائی اسکول (میر گنج) میں بحیثیت اردو ٹیچر ملازم تھا، اور احمد جمال پاشا ذکیہ آفاق اسلامیہ کالج سیوان میں لکچرار تھے، میری رہائش سیوان میں تھی روز ہی آتا جاتا تھا چند ادب نواز احباب کی شام سیوان میں پاشا صاحب کے سسرال نشاط افزا بلڈنگ میں گزرتی تھی، دسمبر 1980ء میں میں نے ساہوجین ہائی اسکول کی ملازمت چھوڑ دی اور گورکھپور آ گیا، لیکن پاشا صاحب سے میرے تعلقات برقرار رہے، 1987ء میں پاشا صاحب بھی داغِ مفارقت دے گئے بطور یادگار میرے چند خطوط احمد جمال پاشا کے پاس محفوظ ہیں جن کو پاشا صاحب کے ایک شاگرد رسید ظفر کمالی نے ان کے خطوط کے مجموعے میں شامل کر لیا ہے۔

ہاں تو بات چل رہی تھی تین افسانہ نگاروں کی جو آج اس دنیا میں نہیں ہیں، ہندوستان اور پاکستان میں بالعموم اور اتر پردیش لکھنؤ میں بالخصوص نفسیاتی افسانہ نگاروں میں ڈاکٹر بشیشر پردیپ کا نام اہم ہے، موصوف کے بیشتر افسانے نفسیاتی ہوتے تھے پورا افسانہ پڑھنے چاہئے، کوئی نہ کوئی نفسیاتی پہلو ابھر کر سامنے آ جائے گا، قاری کو دیر تک افسانے کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دے گا ان کے 9/ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، زندگی نے وفا کی ہوتی تو ابھی اور بھی افسانوی فن پارے اردو زبان و ادب کو دیتے یہی کیا کم ہے کہ زندگی کے آخری دن تک قلم سے رشتہ برقرار رہا 88/اٹھاسی برس کی عمر پائی۔

تیسرے افسانہ نگار عابد سہیل صاحب تھے انہوں نے میرا تحقیقی مقالہ ''اتر پردیش میں اردو افسانہ 1960ء کے بعد'' اپنی نگرانی میں شائع کرائی تھی عابد بھائی حقیقت پسند افسانہ نگار تھے تصنع اور بناوٹ سے

عابد سہیل صاحب مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے میری اور ان کی عمر میں کافی فاصلہ تھی ایک بار میری اور عابد سہیل صاحب کی کہانی ''آج کل'' میں ان کی کہانی کے پہلے شائع ہو گئی، عابد صاحب نے خط لکھ کر مجھے بتایا کہ آپ مجھ سے بڑے افسانہ نگار ہیں، میں نے ان کے خط کے جواب میں لکھا ''ہر بڑا آدمی دوسروں کو بڑا ہی سمجھتا ہے، آج کے عہد میں افسانہ نگاروں سے زیادہ شاعروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، بات کہاں سے کہاں چلی جاتی ہے ایک شاعر ہیں حیرت فرخ آبادی جن کی عمر نوے برس سے تجاوز کر چکی ہے ان سے میری ادبی دوستی ہو گئی، وہ میری کہانیاں پسند کرتے ہیں میں ان سے سیکھتا رہتا ہوں حیرت صاحب نے مجھے نصیحت کی ہے ''چودھری صاحب اپنی کسی کہانی کو اچھی نہ کہئے گا، کیونکہ وہی کہانی آپ سے اچھی کہانی لکھوا لے گی، یہ سچ ہے کہ مجھے اپنی کوئی کہانی پسند نہیں ہے، تاہم جب کسی ادبی محفل میں ادب نواز شخصیتوں کے درمیان میرا کہانی کے ضمن میں غائبانہ ذکر ہوتا ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔

پاک صاف گو انسان تھے تین افسانوی مجموعوں کے علاوہ ان کی خود نوشت ''جو یاد رہا'' خاصی مقبول ہے، میری ان سے خط و کتابت برابر ہوا کرتی تھی، میرے نام ان کے مکتوب کی یہ عبارت دیکھئے، ''چودھری صاحب بہت دنوں سے آپ کی کوئی چیز پڑھنے کو نہیں ملی، قلم سے اتنی بے اعتنائی اچھی نہیں ہے، کیا اپنی چیزیں پاکستان میں چھپواتے ہیں۔

عابد سہیل صاحب مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے میری اور ان کی عمر میں کافی فاصلہ تھی ایک بار میری اور عابد سہیل صاحب کی کہانی ''آج کل'' میں ان کی کہانی کے پہلے شائع ہو گئی، عابد صاحب نے خط لکھ کر مجھے بتایا کہ آپ مجھ سے بڑے افسانہ نگار ہیں، میں نے ان کے خط کے جواب میں لکھا ''ہر بڑا آدمی دوسروں کو بڑا ہی سمجھتا ہے، آج کے عہد میں افسانہ نگاروں سے زیادہ شاعروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، بات کہاں سے کہاں چلی جاتی ہے ایک شاعر ہیں حیرت فرخ آبادی جن کی عمر نوے برس سے تجاوز کر چکی ہے ان سے میری ادبی دوستی ہو گئی، وہ میری کہانیاں پسند کرتے ہیں میں ان سے سیکھتا رہتا ہوں حیرت صاحب نے مجھے نصیحت کی ہے ''چودھری صاحب اپنی کسی کہانی کو اچھی نہ کہئے گا، کیونکہ وہی کہانی آپ سے اچھی کہانی لکھوا لے گی، یہ سچ ہے کہ مجھے اپنی کوئی کہانی پسند نہیں ہے، تاہم جب کسی ادبی محفل میں ادب نواز شخصیتوں کے درمیان میرا کہانی کے ضمن میں غائبانہ ذکر ہوتا ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔

چند ماہ قبل لکھنؤ میں ایک ادیب کہہ رہے تھے، چودھری صاحب ارے وہ ایک ہزار کا نوٹ والے تو نہیں میں نے چودھری صاحب کی کہانی پڑھی ہے، یہ حقیقت ہے کہ کسی افسانہ نگار کی ایک کہانی بھی عوام میں مشہور و مقبول ہو جائے تو وہ افسانہ نگار فنکار ہمیشہ ادبی دنیا میں زندہ رہتا ہے، جیسے قاضی عبدالستار کی کہانی ''پیتل کا گھنٹہ'' اور اقبال مجید کی کہانی ''دو بھیگے ہوئے لوگ''

اچھا تو میں اپنے اصل موضوع پر آتا ہوں'' کہانی کی تلاش'' کی جستجو میں ایک رسالہ'' لاریب'' (لکھنؤ) مارچ 2019ء کا شمارہ دیکھنے لگتا ہوں جریدہ میں ایک کہانی اسلم جمشید پوری کی شائع ہوئی ہے افسانہ کا نام ہے ''اللہ کے نام ایک دعائیہ خط'' کہانی ایک بار پڑھتا ہوں بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی دوسری بار نہایت

سنجیدگی سے مطالعہ کیا تو بات سمجھ میں آ گئی اللہ رب العزت کے ایک گنہگار بندے کا درد جو چیخ چیخ کر اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے نہایت انکساری کے ساتھ دعا گو ہے کہ اے خالق کائنات انسانی ذہن یہ محسوس کر رہا ہے کہ حق و باطل کی جنگ میں حق کو شکست ہو رہی ہے اگر آپ چاہیں گے تو باطل کو نیست و نابود کر دیں گے پوری کہانی ان اللہ علی کل شئی قدیر اور کن فیکون پر مشتمل ہے، کہانی مجھے پسند آ جاتی ہے، یہ کہانی آج کے سماجی معاشرتی اور سیاسی پس منظر کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔

اسلم جمشید پوری معروف افسانہ نگار ہیں کئی افسانوی مجموعوں کے خالق ہیں خوب لکھ رہے ہیں ان کا افسانوی مجموعہ ''عیدگاہ سے واپسی'' خاصی مقبولیت حاصل کر رہا ہے، کئی رسائل دیکھنے کے بعد محترمہ مسرور جہاں صاحبہ کا تازہ ترین افسانوی مجموعہ ''نقل مکانی'' کا مطالعہ شروع کر دیتا ہوں مسرور آپا کو میں 45/برس سے پڑھ رہا ہوں محترمہ 80/برس سے زائد بہاریں دیکھ چکی ہیں اب بھی لکھتی ہیں قلم سے ان کا رشتہ ٹوٹتا ہی نہیں ہے، اس مجموعہ پر پروفیسر شارب ردولوی اور پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی صاحبان نے اپنے تاثرات رقم کئے ہیں، دونوں حضرات اردو دنیا کی نامور اور معتبر اعلیٰ شخصیتیں ہیں جنہوں نے مسرور جہاں کی گرانقدر شخصیت کو اپنے اپنے قلم کی اڑان سے آسمان تک پہنچا دیا ہے، جس کا علم خود مسرور جہاں صاحبہ کو بھی نہیں ہوگا مناظر صاحب نے تو اپنے تاثرات کا عنوان ہی دیا ہے ''مسرور جہاں کے افسانوں کا آسمان''

آپا کی کئی کہانیاں پڑھنے کے بعد ایک کہانی پر آ کر ٹھہر جاتا ہوں جس کا عنوان ہے ''آبِ حیات'' جس کے معنی ہیں، زندگی بخشنے والا پانی' یہ کہانی محبت کرنے والے ایک جوڑے کی کہانی ہے، عرشیہ اور کاشف ایک دوسرے کو چاہتے ہیں والدین کو راضی کر کے دونوں پیار و محبت سے لبریز دنیا بسا کر ایک

آپا کی کئی کہانیاں پڑھنے کے بعد ایک کہانی پر آ کر ٹھہر جاتا ہوں جس کا عنوان ہے ''آبِ حیات'' جس کے معنی ہیں، زندگی بخشنے والا پانی' یہ کہانی محبت کرنے والے ایک جوڑے کی کہانی ہے، عرشیہ اور کاشف ایک دوسرے کو چاہتے ہیں والدین کو راضی کر کے دونوں پیار و محبت سے لبریز دنیا بسا کر ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بن جاتے ہیں اس کہانی میں نظریاتی اختلاف کا ایک طوفان آ جاتا ہے کاشف باپ بننا چاہتا ہے جبکہ عرشیہ ماں بننا نہیں چاہتی ہے، جبکہ ماں بننا عورت کا فطری ارمان ہوا کرتا ہے ماں بن کر ہی عورت مکمل ہوتی ہے اس کی خوبصورتی کم نہیں ہوتی بلکہ اس میں اضافہ ہوتا ہے دل و دماغ میں وسعت پیدا ہوتی ہے، کاشف عرشیہ کی ایک نہیں سنتا اور اسے ماں بننے پر مجبور کر دیتا ہے عاطف نام کا ایک چاند سا بیٹا وجود میں آتا ہے عرشیہ عاطف کو اپنا دودھ نہیں پلاتی ہے وہ نہیں جانتی ہے کہ بچے کے لئے ماں کا دودھ قدرت کی جانب سے عطا کیا ہوا گرانقدر عطیہ ہے، اللہ رب العزت ولادت سے پہلے ہی ماں کے پستانوں میں دودھ کا انتظام فرما دیتے ہیں بچے کے لئے یہی اس کی پہلی غذا ہے۔

مسرور جہاں صاحبہ نے کہانی آبِ حیات کا اختتام بڑے ہی خوبصورت انداز میں کیا ہے حساس قاری کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے، مسرور جہاں صاحبہ کے افسانہ کا آخری اقتباس ایک ماں کا اپنے بچے سے فطری محبت کے جذبے کو عیاں کر رہا ہے، محبت وہ جذبہ ہے جسے دنیا کی تکمیل کا سرچشمہ کہا جا سکتا ہے، خدا نے یہ دنیا محبت کے لئے تخلیق کی ہے اس دنیا میں محبت کا وجود دائمی ہے اسی سے انسانی رشتے استوار ہوتے ہیں ماں باپ بھائی بہن دوست شوہر بیوی یہاں تک کہ محبت ہی زندگی کا جز ہے جو ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے ہیں۔

دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بن جاتے ہیں اس کہانی میں نظریاتی اختلاف کا ایک طوفان آ جاتا ہے کاشف باپ بننا چاہتا ہے جبکہ عرشیہ ماں بننا نہیں چاہتی ہے، جبکہ ماں بننا عورت کا فطری ارمان ہوا کرتا ہے ماں بن کر ہی عورت مکمل ہوتی ہے اس کی خوبصورتی کم نہیں ہوتی بلکہ اس میں اضافہ ہوتا ہے دل و دماغ میں وسعت پیدا ہوتی ہے، کاشف عرشیہ کی ایک نہیں سنتا اور اسے ماں بننے پر مجبور کر دیتا ہے عاطف نام کا ایک چاند سا بیٹا وجود میں آتا ہے عرشیہ عاطف کو اپنا دودھ نہیں پلاتی ہے وہ نہیں جانتی ہے کہ بچے کے لئے ماں کا دودھ قدرت کی جانب سے عطا کیا ہوا گرانقدر عطیہ ہے، اللہ رب العزت ولادت سے پہلے ہی ماں کے پستانوں میں دودھ کا انتظام فرما دیتے ہیں بچے کے لئے یہی اس کی پہلی غذا ہے۔

مسرور جہاں صاحبہ نے کہانی آبِ حیات کا اختتام بڑے ہی خوبصورت انداز میں کیا ہے حساس قاری کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے، مسرور جہاں صاحبہ کے افسانہ کا آخری اقتباس ایک ماں کا اپنے بچے سے فطری محبت کے جذبے کو عیاں کر رہا ہے، محبت وہ جذبہ ہے جسے دنیا کی تکمیل کا سرچشمہ کہا جا سکتا ہے، خدا نے یہ دنیا محبت کے لئے تخلیق کی ہے اس دنیا میں محبت کا وجود دائمی ہے اسی سے انسانی رشتے استوار ہوتے ہیں ماں باپ بھائی بہن دوست شوہر بیوی یہاں تک کہ محبت ہی زندگی کا جز ہے جو ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے ہیں۔

مسرور آپا کی یہ کہانی مجھے پسند آ گئی ہے، جس کہانی کی مجھے تلاش تھی وہ مل گئی ہے میں اپنی کہانی میں یہ درس دینے کی کوشش کروں گا کہ جو عورت اپنے بچے کو دودھ نہ پلا سکے اسے ماں بننے کا کوئی حق نہیں ہے، کیونکہ ماں کا دودھ ہی بچے کے لئے آبِ حیات ہے۔

اللہ رب العزت میری مدد فرمائیں۔

❑❑❑

غزل

زخم دلِ زخم جگر اتنے نمایاں ہوں گے
پھول بن جائیں گے یہ رشک گلستاں ہوں گے

اب نہ روکو مجھے صحرا میں جانے دو
منتظر میرے وہاں خارِ مغیلاں ہوں گے

دل معشوق میں معلوم نہیں کیا کیا ہوگا
دلِ عاشق میں مگر سیکڑوں ارماں ہوں گے

جھوم اٹھیں گے سبھی وجد سا طاری ہوگا
ہم تری بزم میں آکر جو غزل خواں ہوں گے

کچھ ترے گیسوئے برہم کا تقاضا ہے یہی
جتنے بکھریں گے مرے خواب پریشاں ہوں گے

جذب ہو جاتے ہیں یہ خاک میں آنسو لیکن
ترے آنچل پہ گریں گے تو درخشاں ہوں گے

جو گزرنا ہے کفن باندھ لے سر پہ مختارؔ
انکے کوچے میں تری موت کے ساماں ہوں گے

مختار ٹونکی
کالی پلٹن روڈ، پل محمد خاں، ٹونک (راجستھان)
موبائل: 9214826684

غزل

ہماری زندگی کچھ اس طرح سے مسکراتی ہے
ہوا کے دوش پر جیسے کہ خوشبو آتی جاتی ہے

خود اپنے آپ میں اک بار میں نے جھانک کر دیکھا
بلا کی روشنی ہے دور تک رستہ دکھاتی ہے

یہ سچ ہے آج کل میں مسکرانا بھول بیٹھا ہوں
مگر البم میں جو تصویر ہے وہ مسکراتی ہے

سمجھنا جاننا پہچاننا آساں نہیں اس کو
یہ دنیا روز ہی اپنا نیا چہرہ دکھاتی ہے

غموں کے دور میں اس کی تمنا کر رہے ہو کیوں
خوشی آتی بھی ہے تو وہ بڑی مشکل سے آتی ہے

ابھی فتنہ فسادوں کے نہیں رکنے کا وقت آیا
یہ دھرتی لاکھوں کا خوں پی کے بھی لگتا ہے پیاسی ہے

حقیقت یہ ہے کامل تم کبھی میرے نہ بن پائے
مگر دنیا نہ جانے کیوں تمہیں میرا بتاتی ہے

ارشاد احمد کامل
پیر ہیا، کسیا، کشی نگر
موبائل: 9918031008

غزل

ہمارے بس میں کہاں زندگی اگر ہے بھی
اسی کے ساتھ بندھی بندگی اگر ہے بھی

کوئی سرابِ سفر ہے خوشی اگر ہے بھی
دلوں ہی دل میں ہے پنہاں کوئی اگر ہے بھی

صدا تو آتی ہے اندر سے دل دھڑکنے کی
درونِ خانہ چھپی خوش دلی اگر ہے بھی

یہ دل دھڑک تو رہا ہے مگر کہاں کب تک
نہ ہونے جیسی ہے یہ دل لگی اگر ہے بھی

یہ تشنگی ہی مجھے اُس کے پاس لے جائے
یہ بجھنے والی نہیں، تشنگی اگر ہے بھی

اگر کشش ہے تو ہے آب دار ہونٹوں میں
اور اُس کی باتوں میں ہے چاشنی اگر ہے بھی

اُسی کے روپ سے روشن تمام سیّارے
اُسی سے تاج حسیں، چاندنی اگر ہے بھی

ڈاکٹر احمد امتیاز
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی
موبائل: 9899754685

غزل

نہ اچھلنے کے لئے ہے نہ مچلنے کے لئے
ہے تری یاد فقط میرے بہلنے کے لئے

جلوۂ صبح، شفق شام کی بھی دیکھی ہے
یہ جو سورج ہے نکلتا ہی ہے ڈھلنے کے لئے

بڑھ گئی ہے غم جاناں تری شدت اتنی
اشک آنکھوں سے پریشاں ہیں نکلنے کے لئے

موج طوفاں تو مرے گھر کی طرف آتی ہے
کوئی مجبور کرے راہ بدلنے کے لئے

رائیگاں کوششیں سب ہوگئیں میری اب تو
اشک پلکوں پہ ہیں بیتاب مچلنے کے لئے

دیکھئے ملتا ہے کیا مجھ کو مرے شعروں سے
یہ شجر میں نے لگایا تو ہے پھلنے کے لئے

لاکھ طوفاں ہو حمایتؔ اسے بس جلنا ہے
شمع محفل میں اگر ہے، تو ہے جلنے کے لئے

ڈاکٹر حمایت جائسی
2/535، سیکٹر ایچ، کرسی روڈ، جانکی پورم، لکھنؤ
موبائل: 9415394457

غزل

ہے نشہ اک شراب کی مانند
اس کا ملنا سراب کی مانند

ذات میں قید ہو گیا اپنی
لمحہ لمحہ عذاب کی مانند

صرف خوشبو کی ہے کمی اس میں
ورنہ چہرہ گلاب کی مانند

ہے سماعت میں نغمگی اس کی
اس کا لہجہ رباب کی مانند

ہجر کی وسعت تمازت میں
یاد اس کی سحاب کی مانند

وقت نے کر دیا اسے اندھا
تھا کبھی آفتاب کی مانند

لوگ پرواز کیوں اکڑتے ہیں
عمر ہے جب حباب کی مانند

اسماعیل پرواز
242، بیلیلیس روڈ، (ٹکیہ پاڑہ)، ہاوڑہ (مغربی بنگال)
موبائل: 9838813574

غزل

اے میرے خوابوں کی تعبیر بتانے والے
اب تو آ جاؤ بہت دور کو جانے والے

ایک اک لمحہ تری یاد سے وابستہ ہے
دل کی آواز تو سن ہم کو بھلانے والے

تیری قربت کا تو احساس ہے ہر آن مجھے
اپنی دنیا کو بہت دور بسانے والے

دن میں تکتی ہیں نگاہیں کہ تجھے دیکھ تو لیں
رات بھر شمع کے مانند جلانے والے

دل تو دل ہے کہ بنا لیتا ہے خوابوں کے محل
پر کہاں ملتے ہیں محلوں کو سجانے والے

اک ہم ہیں کہ جلاتے ہیں محبت کا چراغ
لاکھ ملتے ہیں چراغوں کو بجھانے والے

خواب کی دنیا سے باہر تو نکل آ احساںؔ
تجھ کو برباد نہ کر دیں یہ زمانے والے

احسان سیوانی
4-B، گرین پارک 504، تھانے (مہاراشٹر)
موبائل: 7518713348

پروفیسر شارب ردولوی۔ پروفیسر عتیق اللہ۔ ڈاکٹر مسرت جہاں اور راقم سبھی اس امر پر اتفاق کرتے ہیں کہ عابد سہیل، ترقی پسند تحریک کی دوسری کھیپ یا نسل کے افسانہ نگاروں میں اپنا ایک الگ مقام اور پہچان رکھتے ہیں۔ یہ وہ نسل ہے جو پہلی نسل کے سائے میں پروان چڑھی، فکر و نظر کے اعتبار سے اس تسلسل و تواتر کی توسیع کا سبب بنی تو رویّوں اور برتاؤ میں اس نے اپنے آپ کو سابقہ نسل سے الگ بھی کیا، یہی برتاؤ اور الگاؤ جن چند اہم افسانہ نگاروں کے یہاں نظر آتے ہیں ان میں اقبال مجید۔ رتن سنگھ جوگندر پال۔ قاضی عبدالستار۔ جیلانی بانو وغیرہ کے ساتھ ساتھ بلکہ بعض مضمون میں ان سب سے قدرے مختلف و منفرد عابد سہیل کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

عابد سہیل کے فکشن میں فلسفیانہ عناصر کے کثرت سے پائے جانے اور ان کی شخصیت کے کئی خانوں میں تقسیم ہو جانے کی وجہ سے پرانے نقادوں نے پھر بھی تھوڑی بہت توجہ کی لیکن نئی نسل کے قارئین و ناقدین نے ان پر کم ہی توجہ دی۔ اسی لیے جب ڈاکٹر مسرّت جہاں استاد شعبۂ اُردو مولانا آزاد اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد کی کتاب بعنوان ''عابد سہیل کے افسانوں میں عصری حسیّت'' موصول ہوئی تو مجھے یک گونہ مسرّت کا احساس تو ہوا ہی کئی گنا حیرت کا احساس ہوا۔ حیرت اس لیے بھی کہ جدید نقادوں نے فن اور فکر کے جو مباحث گذشتہ برسوں میں اُٹھائے اس میں عصریت اور عصری حسیت کو حاشیے پر لا کھڑا کر دیا۔ لایعنی قرار دیدیا۔ طرح طرح کی موشگافیاں کر ڈالیں، کچھ اس طرح سے کہ افسانہ جو بیانیہ کی سادہ اور شفاف صنف ہے اسے چیستاں بنا دیا لیکن اچھی بات یہ ہوئی کہ خود اسی صنف نے جلد ہی اس کا جواب بھی دیدیا اور ثابت کر دیا کہ سادگی۔ شفافیت اور عصریت صنف افسانہ کے وہ بنیادی عناصر ہیں جن کے بغیر تخلیق کی تکمیل ممکن ہی نہیں۔

اچھی بات یہ بھی ہے کہ مسرت صاحبہ نے اپنی اس کتاب کے جو عنوانات قائم کیے ہیں ان میں عصری حسیّت اور اُردو افسانہ کے عنوان سے کارآمد گفتگو کی ہے۔ یہ گفتگو کتاب کے درمیان ہوتی ہے جبکہ اسے سب سے پہلے ہونا چاہیے۔ لیکن پیش لفظ میں بھی عصریت اور عصری حسیّت پر اچھی گفتگو کی گئی ہے۔ جس سے تلافی بھی ہوتی ہے اور ایک با معنی تمہید کی تشکیل بھی ہوتی ہے۔ لیکن اصل باب میں جہاں سماج اور معاشرہ کی ناہمواریوں اور ناانصافیوں کا ذکر ملتا ہے اور یہ بھی کہ یہ وہ عناصر ہیں جو سماج میں ہمیشہ رہے اس لیے کہ سماج کی تشکیل اور دولت و طاقت۔ ذات پات کی تفریق نے اسے ہمیشہ نہ صرف زندہ بلکہ سرگرم رکھا۔ فنکار کی انسان دوستی اور دردمندی نے ادب میں اور بالخصوص فکشن میں عام طور پر انہیں موضوعات کو زیادہ پیش کیا گیا۔ اس کی بڑی وجہ فنکار کی حسیّت ہے اور معاشرہ کی بے حسی، سماج کے اس تضاد (Paradox) نے فنکاروں اور قلمکاروں کو ہمیشہ متوجہ کیا۔ بانیٔ افسانہ پریم چند تو اپنے تخلیقی سفر کی ابتدا ہی اسی سماجی کشمکش اور تصادم اور تضاد سے کی جس کے بامعنی و با مقصد اثرات دور تک پھیل گئے اور اسے پھیلنا ہی تھا۔ مسرّت جہاں نے ابتدا میں ہی کہا۔

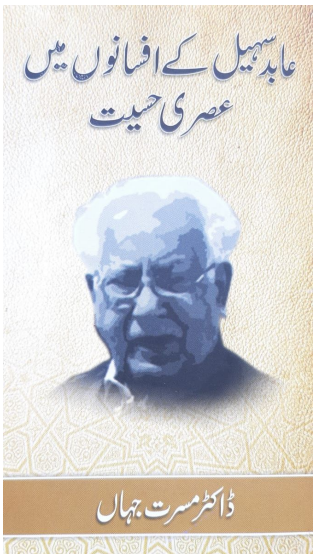

مبصر : پروفیسر علی احمد فاطمی

قیمت : 194 روپے

ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

ملنے کا پتہ

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

''عابد سہیل کے افسانے عصری حسیت کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے افسانوں میں معاشرہ سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ سماج کے مسائل اور واقعات سے عابد سہیل پوری طرح واقف نظر آتے ہیں بلکہ بیشتر جگہ اس کا حصہ نظر آتے ہیں اسی لیے ان کے افسانوں کے موضوعات مانوس سے لگتے ہیں اور کردار جانے پہچانے معلوم ہوتے ہیں۔

''عابد سہیل کے افسانوں میں عصری حسیت کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ انہوں نے اپنے عہد کے موضوعات کو افسانوں میں اس طرح پرو دیا ہے معنوں سمندر کو کوزے میں سمو دیا ہو۔ عابد سہیل نے متوسط طبقے کے مسائل پیش کیے ہیں۔ عابد سہیل کے افسانے کرداری نہ ہو کر موضوعاتی ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا دائرہ کار قومی بلکہ عالمی سطح پر پھیلا ہوتا ہے اور غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ مذہب و مسلک۔ فسادات سے پیدا شدہ خوف و دہشت۔ انسانی بے حسی۔ تہذیبی قدروں کا زوال وغیرہ ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں اور سب سے آخر میں یہ جملے۔

''عابد سہیل ایک مثالی سماج کے قائل تھے۔ ایک مذہب معاشرہ جہاں کے لوگ تہذیبی قدروں کے امین ہوں۔ ہندوستان کی صدیوں پرانی گنگا جمنی تہذیب کو باقی رکھنے کا کام انہوں نے اپنے افسانوں سے لیا ہے۔ اپنے معاشرے کے تمام پہلو کو۔ اپنے معاشرے کے احساس کو انہوں نے اپنے افسانوں میں سمیٹ لیا ہے۔ اسی لیے ان کی کہانیاں عصری حسیت سے بھرپور نظر آتی ہیں۔''

مسرت جہاں کے ان خیالات سے صد فی صد اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ افسانہ اور ترقی پسند افسانہ یوں بھی انہیں خصوصیات کی وجہ سے اپنی غیر معمولی شناخت رکھتا ہے۔ ترقی پسندوں کی اس بھیڑ میں عابد سہیل کی پہچان بھی الگ ہے جیسے کی مسرت نے باحد محنت و لگن کے ساتھ ایک عمدہ تصویر۔ تعبیر اور تفسیر پیش کر دی۔ جس کے لیے وہ مبارک باد کی مستحق ہیں۔ کتاب میں عابد سہیل کی صحافت۔ تنقید وغیرہ پر بھی مختصر گفتگو کی گئی ہے اس میں کوئی حرج تو نہیں لیکن سب واقف ہیں کہ عابد سہیل کی بنیادی اور بڑی حیثیت افسانہ نگار کی ہے اور وہ بھی ترقی پسند افسانہ نگار اور ترقی پسند فکر عصری حسیت کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ عصری حسیت یوں تو بظاہر خارجی ہوتی ہے لیکن دردمند افسانہ نگار کے باطن کو چھیڑتی ہے جس سے عابد سہیل جیسے فنکار پیدا ہوتے ہیں۔ مسرّت جہاں نے یہ پروجیکٹ عمدہ طریقہ سے انجام دیا ہے۔ اگر اس میں شارب ردولوی، عتیق اللہ کی تحریریں نہ بھی ہوتیں تب بھی کتاب کی اہمیت کم نہ ہوتی لیکن ان کی موجودگی سے اس کی اہمیت و افادیت میں بہر حال اضافہ ہوتا ہے۔ 320 صفحات کی اس کتاب کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے اتنے ہی عمدہ طریقہ سے شائع کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب عصری حسیت کی واضح صورتوں کے ساتھ عابد سہیل کے فکری اور تخلیقی سفر کی تفہیم میں اہم رول ادا کرے گی جس کے لیے مسرّت جہاں واقعتاً مبارک باد کی مستحق ہیں۔ ❑❑❑

وقار ناصری کی تازہ ترین کتاب پروفیسر مہدی حسین ناصری۔ افکار و آثار کو ادبی حلقوں میں مقبولیت کا شرف حاصل ہوگا۔ کتاب کا آغاز محمد حسین آزاد کے اس قول سے ہوا جس سے وقار ناصری کے نصب العین کا ادب کے تعلق سے پتہ چلتا ہے۔ مہدی حسین ناصری ایک متحرک سرگرم اور با صلاحیت ادیب نقاد مصنف اور با کمال شاعر ہیں۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو قابل توجہ بھی ہے۔ مذکورہ کتاب میں تحریر کردہ موضوعات کو یکجا کرنا آسان نہیں تھا لیکن ایک بہترین قلم کار وقار ناصری نے اس مشکل کام کو مجتمع کر دیا ہے کہ کتاب قابل مطالعہ ہے، لائق قرأت ہے۔

تمام مشمولات لکھنؤ اور اس کا ادبی ماحول، دبستان لکھنؤ کی شعری روایات اور پروفیسر مہدی حسین ناصری کا ان سے شیفتگی، اساتذۂ لکھنؤ سے ان کے مراسم اور ہم عصر شعرائے کرام سے ان کے تعلقات کا تنقیدی جائزہ مصنف نے نہایت دل چسپ انداز میں رقم کر دیا ہے۔ مہدی حسین کی زندگی کے مختلف گوشوں سے جہاں آشنا کیا وہی دوسری طرف ان کے ابتدائی کلام کے رموز و نکات بطور خاص ان کی غزل گوئی کو تغزل کی چاشنی سے لبریز قرار دیا۔ اس کے ساتھ ہی اردو ادب کی دیگر شعری اصناف قصائد، رباعیات، مخمس اور فارسی کلام کے محاسن بیان کرنے میں صاحب کتاب کی محنت شاقہ پر رشک آتا ہے۔ نثری نقوش پر مبنی باب بھی دل چسپی سے عاری نہیں ہے۔ اس طرح سے شہر نگاراں لکھنؤ کی ادبی حیثیت کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کی ادبی تاریخ کو اختصار کے ساتھ سمو دیا ہے جو کم از کم ان قارئین کے لئے جو لکھنؤ کی ادبی اور علمی خدمات سے لاعلم ہے ان کے لئے یہ کتاب بیش قیمت تحفہ ہے۔ صاحب کتاب نے کتاب کے مشمولات پر بھی گفتگو کی ہے جس میں ان کے سنجیدہ تنقیدی پہلو کے ساتھ مہدی حسین کے ستائشی پہلو کا رنگ زیادہ شوخ ہے جسے وقار ناصری کے مدلل مداحی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس سے موضوعات کے الگ الگ گوشوں کے قوس و قزحی رنگ عیاں ہو رہے ہیں۔ کتاب میں مصنف نے اردو زبان و ادب کے تعلق سے مہدی حسین ناصری کے جوش و خروش کی بھرپور تعریف کی ہے اور انھیں نئی شیرازہ بندی اور معیار سازی میں نمایاں کردار ادا کرنے والا فنکار لکھ دیا ہے جس سے ان کے طرز فکر اور ان کے کارناموں پر مثبت روشنی پڑتی ہے۔ وقار ناصری نے ان کی تخلیقیت کا بڑی دیانت داری کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔

ماضی کا غم، حال کی پریشانی مستقبل اور تاریخ کی رفتار سے نا واقفیت ان حالات نے پروفیسر ناصری کی شاعری پر اثرات مرتب کئے ہیں۔ صفی لکھنوی کا ایک مصرعہ اس امر کا مصداق ہے

'رنگ رخ بدلا کیا گردش میں جب تک جام تھا'

کلام ناصر کے مدلل تجزیہ نے ان کے فن پاروں میں ایک روشن شعور اور پاکیزہ ذوق کی ترویج کو بیدار کیا ہے۔ معاصر شعراء میں یوں تو ناصری کے تقریباً سبھی شعرا سے مراسم تھے لیکن اس طویل کے فہرست میں صفی، عزیز، ثاقب، محشر، حامد علی خان وغیرہ سے ان کی خاص قربت تھی۔ 'ذکر ناصری' کے عنوان سے صفی نے ایک شاندار مدحیہ نظم آپ کی

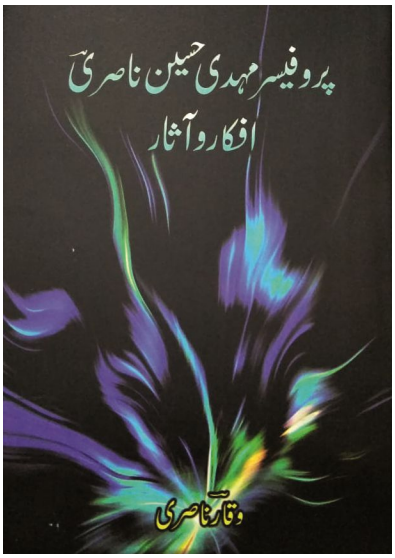

مبصر : ڈاکٹر زیبا محمود

قیمت : 500 روپئے

ناشر : وقار ناصری، شیش محل، حسین آباد، لکھنؤ

ملنے کا پتہ

دانش محل، امین آباد، لکھنؤ

شان میں لکھا چند اشعار مثال کی طور پر پیش کر رہی ہوں۔

آپ نقاد سخن بھی ہیں سخنور خود بھی
نثر میں نظم میں ہر صنف میں پایا برتر
فلسفی بھی ہیں مورخ بھی ہیں ماشاء اللہ
ایک گلدستہ ہر اک رنگ کہ جس میں گل تر
شوق تصنیف سے بھی ذوق ہے تالیف سے بھی
ماہر السنہ دیں مختلف نام آور

اسی طرح فراق گورکھپوری نے اپنے مجموعہ کلام روح کائنات میں ناصری کے فیض محبت کا اقرار کیا ہے۔ شاگردوں میں فراق گورکھپوری کے ساتھ ڈاکٹر سید اعجاز حسین کا نام بھی شامل ذکر ہے۔ صاحب کتاب وقار ناصری نے اپنی تحقیقی بصیرت کے تئیں اس غلطی کی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ فراق اور اعجاز حسین نے ناصری کا نام مہدی حسن لکھا ہے جبکہ ان کا اصل نام مہدی حسین ہے۔ مصنف نے اس ضمن میں ناصری کا ایک شعر پیش کیا جو خود شاہد ہے کہ۔

ارتباط باہمی ثابت ہے بین المشرفین
ہم عدد بھی ہیں علی عبّاد اور مہدی حسین
(ناصری۔ نذر احباب۔ ص ۵۹)

تصوف کے مضامین کو برتنے کا بھی ہنر آپ میں بدرجہ اتم موجود ہے لیکن کہیں کہیں حزنیہ لہجہ دبا ہوا محسوس ہوتا ہے کیونکہ بقول صاحب کتاب مہدی حسین ناصری کا محبوب شاعر میر تقی میر تھا اس لئے کلام میں سوز و گداز کے جملہ عناصر موجود ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کتاب پروفیسر مہدی حسین ناصری کے تعلق سے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ مواد کی یکجائی کی منطقی اور استدلالی اظہار نے کلام ناصر کی وسعت کو نمایاں کیا ہے اور ادب کی صالح روایت کی نئی تصویر پیش کیا ہے۔ اس کتاب کی دانشورانہ نمو کی تقلید کی جائے گی اس کا مجھے یقین ہے۔ کتاب ایک ایسی دروں بینی اور ضوفشانی کا مظہر ہے جس کے منظر عام پر آنے کے سلسلے میں وقار ناصری نے بڑی عرق ریزی اور جاں فشانی کا ثبوت دیا ہے۔ متنوع موضوعات کی شانہ آرائی کا انہا کی انداز قابل غور ہے جس سے مواد کی اہمیت اور لطافت کا سنہرا باب ضرور وا ہوا ہے۔

تحقیقی کام کرنے کا وقار ناصری کے پاس سلیقہ بھی ہے اور شعور بھی۔ بہر کیف یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہر لائبریری کی زینت بنے تاکہ ذوق شناسان ادب اس کے مطالعہ سے گزرے۔ سلیقے سے مزین، ترتیب کی دلکشی مطالعہ کو شوق کو بڑھاتی ہے اور ہمارے ذہن پر انبساطی کیف برپا ہوتا ہے۔ کتاب کے ہر باب میں شامل اقتسابات اگر نقل کئے جائیں تو طوالت کے خدشے سے ایسا کرنے سے قاصر ہوں۔ اس کی ترتیب و تہذیب میں وقار ناصری نے یقینی طور پر دیدہ ریزی سے کام لیا ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ ایک مبسوط کتاب شائع ہوئی ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ وقار ناصری کا یہ ادبی اور تحریری سفر جاری رہے اس طرح کی تحقیقی کتابیں منصۂ شہود پر آتی رہیں۔ الغرض اہل علم و دانش کہ تحریریں ہی اردو زبان و ادب کی بقا کا ضامن ہیں۔ ❑❑❑

اردو ادب میں حیات اللہ انصاری اس شخصیت کا نم ہے جن سے تقریباً تمام اہل اردو واقف ہیں۔لکھنؤ کے ادبی ماحول میں ان کی ادبی تربیت ہوئی۔حیات اللہ انصاری کی شخصیت کے متعدد پہلو ہیں۔ایک طرف وہ افسانوی ادب تخلیق کرتے تھے تو وہیں دوسری جانب حقیقت پسندانہ صحافت سے بھی وابستگی تھی۔آپ ایک سوشل ورکر بھی تھے۔ان کی سماجی خدمات بحیثیت راجیہ سبھا ممبر کے بھی رہی ہیں۔آپ کی شہرت نہ صرف ان کے ناول ''لہو کے پھول'' سے ہے بلکہ ان کے افسانے بھی ان کی شہرت دوام میں ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔حیات اللہ انصاری کی حیات وخدمات پر متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ان کی تخلیقات پر پی ایچ ڈی اور ایم فل بھی ہو چکے ہیں۔ان کی ادبی خدمات کا جائزہ بھی گاہے گاہے لیا جاتا رہا ہے۔ابھی حال ہی میں ایک تازہ کتاب ''افسانوی ادب اور حیات اللہ انصاری'' کے عنوان سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی ہے۔اس کتاب کو ادبی ذوق کے حامل اور اردو کی خدمت میں اپنا وقت صرف کرنے والے لکھنؤ کے ایک ادب دوست جناب محمد اویس سنبھلی نے مرتب کیا ہے۔یہ کتاب دراصل حیات اللہ انصاری پر منعقدہ ایک سمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔

زیر نظر کتاب میں اردو کی ممتاز شخصیات بشمول پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر علی احمد فاطمی اور پروفیسر قمر الہدی فریدی کے مضامین شامل ہیں۔ایک طرف جہاں پختہ قلم کاروں کی تحریریں اس کتاب کی زینت ہیں تو وہیں دوسری جانب نوجوان قلم کاروں کے مضامین کو بھی اس میں جگہ دی گئی ہے۔اس کتاب میں حیات اللہ انصاری کی شخصیت کے متعدد پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔بالخصوص ان کے افسانوی ادب کا احاطہ کرتے ہوئے ادب میں ان کی تحریروں کے مقام ومرتبے کا تعین اس کتاب کا نصب العین ہے۔اسی وجہ سے حیات اللہ انصاری کی متعدد تخلیقات کا تجزیہ بھی اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر قمر الہدی فریدی، رفعت ملک، ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی، پروین شجاعت، راشد خاں ندوی، حمیرا عالیہ، اطہر حسین، محمد ارشد اور شاہد حبیب نے حیات اللہ انصاری کے افسانوں پر بالعموم گفتگو کرتے ہوئے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔

ان مضامین میں حیات اللہ انصاری کے افسانوں کے موضوعات، ان کے اندر حقیقت بیانی، سماجی مسائل اور حقوق انسانی جیسے نکات پر بحث کی گئی ہے۔چند مضامین حیات اللہ انصاری کے ناول اور افسانوں کے تجزیے پر مشتمل ہیں۔مثلاً ان کے ناول ''لہو کے پھول'' کا جائزہ پروفیسر نیر مسعود اور ڈاکٹر عشرت ناہید نے لیا ہے اور ''مدار'' پر ڈاکٹر شاہ نواز فیاض اور ڈاکٹر یوسف وانی نے گفتگو کی ہے۔اسی طرح حیات اللہ انصاری کے افسانوں آخری کوشش، شکستہ کنگورے اور شکر گزار آنکھیں کا تجزیہ بالترتیب ڈاکٹر عمیر منظر، ڈاکٹر فرقان سنبھلی اور محترمہ عزہ معین نے کیا ہے۔'ماں بیٹا' کا تجزیہ ڈاکٹر ثوبان سعید اور موسیٰ رضا نے پیش کیا ہے۔کتاب کے آخر میں حیات اللہ انصاری کا ایک مختصر سوانحی خاکہ بقلم ڈاکٹر انوار احمد بھی شامل ہے۔

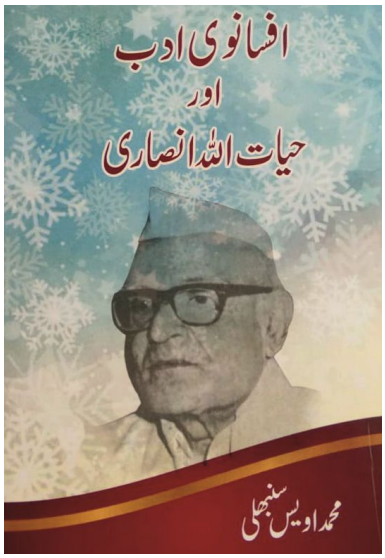

مبصر : ڈاکٹر سلمان فیصل

قیمت : 299 روپے

ناشر : احساس ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر فاؤنڈیشن ٹرسٹ

ملنے کا پتہ

احساس ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر فاؤنڈیشن ٹرسٹ، لکھنؤ

صاحب کتاب محمد اویس سنبھلی نے اپنے پیش لفظ میں حیات اللہ انصاری کی حیات و خدمات کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرتے ہوئے اہل ادب کے حضور میں شکوہ بھی کیا ہے حیات اللہ انصاری کی خدمات کا اعتراف جس قدر ہونا چاہیے تھا ویسا نہیں کیا گیا۔اسی وجہ سے انھوں نے ایک سمینار کا انعقاد کیا تاکہ حیات اللہ انصاری کی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا جائے اور بالخصوص ان کے افسانوی ادب کا احاطہ کیا جائے۔حیات اللہ انصاری کی شخصیت کی عکاسی کرتے ہوئے محمد اویس سنبھلی نے لکھا ہے کہ ''حیات اللہ انصاری کا شمار لکھنؤ کی قدآور شخصیات میں ہوتا ہے۔وہ نہ صرف ایک اچھے صحافی تھے بلکہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ان کا مشاہدہ بہت گہرا تھا اور وہ سماج کے ہر طبقے کے افراد کی نفسیات سے بخوبی واقف تھے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں کرداروں کی ایک دنیا بسائی ہے جہاں آپ کو ہندوستان کے ہر طبقے اور ہر قسم کے افراد ملیں گے۔نیز زبان و بیان کی شستگی وصفائی اسلوب کی معنویت اور گہرائی نے بھی ان کے افسانوں کو جلا بخشی ہے۔حیات اللہ انصاری کے یہاں معمولی واقعات میں بھی غیر معمولی رموز پنہاں ہوتے ہیں۔فکری اعتبار سے ان کا تعلق اس نسل سے ہے جس کے جد امجد پریم چند ہیں۔''

سمینار میں پروفیسر صغیر افراہیم کے ذریعے پیش کیا گیا صدارتی خطبہ بطور مقدمہ شامل کتاب ہے۔انھوں نے اپنے خطبے میں سمینار کے مقالوں پر بھرپور تبصرہ فرمایا ہے۔پروفیسر صغیر افراہیم نے حیات اللہ انصاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ ''حیات اللہ انصاری اپنے عہد کے بدلتے ہوئے رجحانات کو ملحوظ رکھتے ہوئے شہری اور دیہی سماج کو موضوع بنایا۔ان کی تمثیل پسندی آدمی کی برائی کو نہیں اس کی اچھائی کو دیکھتی تھی۔غلاظت، مفلسی اور ناداری میں رہنے کے باوجود انسانی خودداری اور ازلی شرافت قائم و دائم تھی جس کا اظہار وہ فکشن میں کرتے تھے۔۔۔ناول ہو یا افسانہ انھوں نے معمولی سے معمولی واقعے کو اس طرح ڈھالا ہے کہ وہ فن پارہ معاشرے کا عکاس بن کر قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا ہے۔''

مجموعی طور پر حیات اللہ انصاری کے فکشن کو سمجھنے کے لیے ایک مفید کتاب ہے۔اویس سنبھلی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک کامیاب سمینار کے انعقاد کے بعد ایک مفید کتاب بھی اہل نظر کی خدمت میں پیش کی ہے۔کتاب کی طباعت عمدہ اور سرورق دیدہ زیب ہے۔امید قوی ہے کہ اردو ادب کے ذخیرے میں یہ کتاب گراں قدر اضافے کا باعث ثابت ہوگی۔

❑❑❑

زیرِ نظر کتاب ''اختصاصِ تنقید'' ڈاکٹر عطیہ رئیس کے بیس ۲۰ مضامین کا مجموعہ ہے۔ڈاکٹر عطیہ رئیس کی اس سے قبل بھی کئی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں اور داد وتحسین حاصل کرچکی ہیں۔مذکورہ کتاب میں جو مضامین شامل ہیں وہ اپنے موضوعاتی دروبست کے لحاظ سے بے حد اہم ہیں۔ڈاکٹر عطیہ رئیس چوں کہ دلی کی رہنے والی ہیں۔اس لئے اس کتاب کا پہلا مضمون ہی دلی کی تاریخ اور یہاں کے صوفی بزرگ شاہ ولی اللہ پر ہے۔ اس مضمون میں اٹھارہویں صدی کی دلی پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے تاریخی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سیاسی اور سماجی حالات کے جبر پر بھی نگاہ ڈالی گئی ہے۔اس وقت کے حالات میں شاہ ولی اللہ نے کیا اور کیسا کردار نبھایا اس کو مدلل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔خصوصاً ان کے خطوط میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اس کی روشنی میں اٹھارہویں صدی کی دلی کا تاریخی جائزہ غور وفکر کی طرف متوجہ کرتا ہے۔دوسرا مضمون بھی دلی اور غالب کے تعلق سے ہے۔اس مضمون میں دلی کے تذکرے کو کلامِ غالب میں تلاش کیا گیا ہے اور شہر دلی کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔دلی کے حالات یہاں کے ماحول، رسم ورواج اور تہذیبی عناصر کی تلاش اس مضمون کا اصل مقصد ہے۔ایک مضمون حالی کی تنقید پر ہے۔''مقدمہ شعر و شاعری'' ہماری تنقید کی بنیاد ہے۔اس میں حالی نے تنقید کے اصول وضع کئے ہیں اور شعر، شاعری، شاعر اور سماج کے مابین جو رشتہ ہے اس پر جو تنقیدی بحث ہے، اس کا جائزہ عطیہ رئیس نے معروضیت کے ساتھ لیا ہے۔ایک مضمون سرسید کے نثری اسلوب پر ہے۔سر سید نے تعلیمی محرکات کے لئے جو قدم اٹھائے تھے اس پس منظر میں ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔سرسید کی نثر نے ہماری بہت سی نثری اصناف کے لئے راستے ہموار کئے تھے۔اس مضمون میں انہیں کو پیش کیا گیا ہے اور ان کے اسلوب کی روشنی میں ان کے مقام اور مرتبہ کو پرکھا گیا ہے۔میر انیس کی مرثیہ نگاری پر جو مضمون ہے وہ دبستانِ لکھنؤ کی شعری خصوصیت کو پیش کرتا ہے۔اس مضمون میں میر انیس کے شعری تلازموں کو بھی پیش کیا گیا ہے اور ان کے خصوصی استعاروں پر روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ میر انیس کا مقام متعین کیا جا سکے۔علاوہ ازیں اس کتاب میں شامل دیگر اہم مضامین میں مرزا ہادی رسوا کی ناول نگاری، اکبر الہ آبادی کی ظرافت، دبستانِ لکھنؤ اور

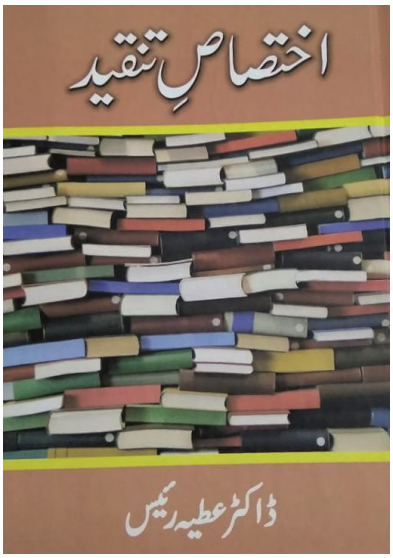

مبصر : ڈاکٹر امتیاز احمد

قیمت : 200 روپئے

ناشر : ایم آر پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی

ملنے کا پتہ

ایم آر پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی

جرأت کا شعری اختصاص، بانگِ درا کی نظمیں، فیض کی غزل گوئی، بیدی کی افسانہ نگاری، انشائیہ نگاری، نظم جدید کا سفر وغیرہ بے حد اہم مضامین ہیں جن سے نہ صرف معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ اردو ادب میں رونما ہونے والے محرکات کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ مضامین ہماری فکری محرکات کا سبب بھی بنتے ہیں۔ان مضامین کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ ڈاکٹر عطیہ رئیس نے، موضوع اور اسالیب کا محاکمہ اپنی تنقیدی بصیرت کی بنیاد پر کیا ہے۔جس میں اس بات کا پورا پورا خیال رکھا ہے کہ کسی طرح کے ذاتی اصراف و تصریف کے معاملات کو روا نہ رکھا جائے۔وہ اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوئی ہیں۔حالانکہ یہ ایک قلمکار کے لئے بہت ہی نازک مسئلہ ہوتا ہے۔بعض ناقدین اس طرح کی غیر نفسیاتی تصرف وتجاوز کے شکار ہوجاتے ہیں، نفسون مضمون جس کا متقاضی نہیں ہوتا۔جس کی وجہ سے تحریر ایک الگ معرض بحث میں داخل ہوجاتی ہے، اور خامخواہ کی ایک غیر مفید بحث وتمحیص کا راستہ وا گزار ہوجاتا ہے۔

ڈاکٹر عطیہ رئیس کی زبان نہایت سلیس اور سادہ ہے۔ان کی تحریر میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں ہے جس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ڈاکٹر عطیہ کا ذہن ادب، ادیب اور اصناف کے تعلق سے صاف اور واضح ہے۔ان کے مضامین ان کے مطالعے اور غور وفکر کا پتہ دیتے ہیں۔اس کتاب میں مضامین کا انتخاب سنجیدہ اور معنی خیز ہے۔ساتھ ہی ساتھ پرانے اور نئے لکھنے والوں کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔شمیم نکہت پر لکھا گیا خاکہ بے حد عمدہ اور ان کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔نند کشور وکرم، سعید خاں زیدی، میکش امروہوی اور عظیم اختر جیسے عصر حاضر کے لکھنے والے بھی اس کتاب کا حصہ ہیں۔اس کتاب میں شامل مضامین جیسا کہ خود مصنفہ نے اعتراف کیا ہے کہ ادبی سمیناروں کے لئے لکھے گئے ہیں اور انہیں پیش بھی کیا گیا ہے۔اب ضرورت اس بات کی تھی کہ دیگر اصحاب کے لئے بھی قرأت نواز ہو، تو اس غرض سے یہ کتاب ترتیب دی گئی ہے۔۱۷۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا ٹائٹل دیدہ زیب ہے اور قیمت بھی مناسب ہے۔یہ طلباء، اساتذہ اور اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک تحفہ ہے۔

❑❑❑

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ پریاگ راج میں بھارت چھوڑو آندولن کی ۷۷ ویں سال گرہ
کے موقع پر شجر کاری پروگرام میں ۷۶ ہزار ۸۲۳ مفت پودا تقسیم کے گنیز ورلڈ رکارڈ کی سند کے ساتھ (۹/ اگست ۲۰۱۹ء)

اتر پردیش کی گورنر محترمہ آنندی بین پٹیل اور وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ
راج بھون میں نومنتخب وزراء کے ساتھ (۲۱/ اگست ۲۰۱۹ء)

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ پریاگ راج میں بھارت چھوڑو آندولن کی ۷۷ ویں سال گرہ کے موقع پر
منعقد 'شجر کاری مہا کمبھ' کے موقع پر کمشنر الٰہ آباد جناب آشیش گوئل کو سمجن کا پودا دیتے ہوئے (۹/ اگست ۲۰۱۹ء)

उर्दू मासिक
नया दौर
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ
ودھان بھون کیمپس میں ۷۳ ویں یوم آزادی کے موقع پر
پرچم کشائی کرتے ہوئے (۱۵/اگست ۲۰۱۹ء)

اتر پردیش کی گورنر محترمہ آنندی بین پٹیل
گورنر ہاؤس میں ۷۳ ویں یوم آزادی کے موقع پر
پرچم کشائی کرتے ہوئے (۱۵/اگست ۲۰۱۹ء)

वर्ष : 74 अंक 3-4
अगस्त 2019
मूल्य : 15 रु./–
वार्षिक मूल्य : 180 रु./–

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663

प्रकाशक व मुद्रक, **f'kf'kj]** निदेशक द्वारा सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. के लिए प्रकाश पैकेजर्स, 257 गोलागंज, लखनऊ से
मुद्रित एवं प्रकाशन प्रभाग, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र., सूचना भवन, पार्क रोड, लखनऊ–226001 से प्रकाशित–सम्पादक, **सैयद आसिम रज़ा**